تصوف اسلام

عبدالماجد دریابادی

تصوّفِ اسلام

اسلامی تصوّف کا عطر، قدماء صوفیہ کی تعلیمات کا لب لباب
اور ان کی تصانیف پر تبصرہ

از
عبدالماجد دریابادی

قیمت

تین روپیہ پچاس پیسے

ناشر

نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

ٹیلیفون ـ ۲۴۵۵۹

ناشر عزیز الرحمن | بار پنجم جولائی ۱۹۷۰ء | پرنٹر الواعظ صفدر پریس لکھنؤ

فہرستِ مضامین

تصوّفِ اسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع پنجم

سنہ ۱۹۷۰ء

۴۵ سال سے کچھ اوپر ہی ہونے کو آئے کہ اس کم سواد و بے استعداد نے تصوّف اسلام کے موضوع پر کچھ ورق سیاہ کر ڈالے تھے کسی کی ستّاری نے اس پر سایہ ڈالا اور اُسے حسنِ قبول کے آغوش میں لیا کتاب چھپی اور جب سے اب تک بار بار چھپی یہاں تک کہ اب نوبت پانچویں اڈیشن کی آگئی۔ کتاب میں مغز ہی کیا ہے لیکن اپنی والی لیس پوت بہرحال ہر بار کچھ کر ہی لیتا ہوں اور وہی عمل ابکی بھی جاری رہا لفظ و عبارت کی کتر بیونت اس طرح کچھ ہو ہی جاتی ہے۔ مغز کی کوتاہیوں اور ناہمواریوں کو ہمیشہ کی طرح ابکی بھی کسی کی صفت ستّاری ہی کے حوالے کرتا ہوں۔ اپنا بس چلتا تو اپنی پرانی تحریروں میں سے کسی کا شاید ایک پرزہ بھی سالم و محفوظ نہ چھوڑتا۔

عبدالماجد

دریاباد، ضلع بارہ بنکی

اپریل سنہ ۱۹۷۰ء

دیباچہ طبع چہارم

سنہ ۱۳۸۴ھ
۱۹۶۵ء

اس حقیر سی کتاب کو اول بار نکلے ہوئے ۴۰ سال گزر چکے۔ اور اس لمبی مدت میں ان اوراق کا جامع کہاں سے کہاں پہونچا۔ ساری درمیانی منزلوں کا بیان نہ یہاں ممکن ہے اور نہ یہ مقصود۔ انداز فکر اور اسلوب بیان کے جو جو دور گزر کرچکے ہیں اُن کا پتہ بقدر ضرورت تینوں اڈیشنوں کے دیباچوں سے چل جائے گا۔ موجودہ اڈیشن کے وقت کتاب پر نظر ثانی تو اول سے آخر تک کرلی گئی اور لفظ و عبارت میں ترمیم و اصلاح بھی اچھی خاصی ہوگئی۔ معنوی ترمیم سے بھی کہیں کہیں کام لیا گیا ہے تاہم کوئی بنیادی بلکہ اہم ترمیم بھی مناسب نہیں خیال کی گئی۔ ــــ گو ظاہر ہے کہ جو کتاب ۷۲ سال کی عمر میں لکھی جاتی وہ قدرتاً اس سے بہت مختلف ہوتی جو ۳۲ سال کے سن میں لکھی گئی۔

غلطیاں، خامیاں، لغزشیں، ہر سن و سال میں لازمۂ بشریت ہیں۔ فرق یہ ہے کہ جوانی کی نظر اپنی کوتاہیوں کی طرف کم جاتی ہے۔ زیادہ سن آجانے پر اپنی عقل و فکر کی نارسائی، اپنی تحقیق کی ناصوابی، اپنی نظر کی کوتاہی، یہ سب واضح و نمایاں ہو جاتی ہیں۔

بہرحال اب دعا صرف اس قدر ہے کہ اس مجموعہ اوراق کے جو حصے صحیح و مرضیٔ حق کے مطابق ہیں اللہ اُسے اُمت، ملت، انسانیت کے حق میں نافع و

بابرکت بنائے اور جو حصہ باطل و خلاف حق ہو اس سے عفو و درگزر فرمائے۔

دریاباد
ضلع بارہ بنکی
جنوری ۱۹۶۵ء، مطابق رمضان ۱۳۸۴ھ

عبدالماجد

طبع سوم

۱۳۶۵ھ

۱۹۴۶ء

عربی میں ایک مقولہ چلا آتا ہے کہ فقہ تو پڑھی وڑھی نہیں، لیکن کتاب فقہ پر لکھ ڈالی ہے، اردو میں بھی چلی ہوئی مثل ہے کہ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل ـــــ یہ کہاوتیں کسی اور پر صادق آتی ہوں یا نہ ہوں، ان سطور کے راقم پر تو ضرور ہی صادق ہیں، تصوف، حقیقت تصوف، تاریخِ تصوف، فلسفۂ تصوف، فن کے ظاہری و باطنی کسی شعبہ سے کوئی علاقہ نہیں، لیکن کتاب فن پر تیار! ـــــ اس لئے اجازت ہو تو قبل اس کے کہ ناظرین کچھ آگے بڑھیں انھیں عربی کے اس مشہور عارفانہ و حکیمانہ کلام کی یاد ایک بار دلادی جائے کہ

انظر ما قال ولا تنظر الیٰ من قال،

نظر صرف قول پر رکھئے قائل کو نظر انداز کیجئے، بس یہ دیکھئے کہ بات کہی کیسی گئی یہ نہ دیکھئے کہ کہنے والا بھی کسی شمار و قطار میں ہے۔

کتاب ۲۳-۱۹۲۲ء کی لکھی ہوئی ۲۲-۲۳ سال بعد آج پریس میں تیسری بار جارہی ہے، اور نظر ثالث کے دور سے نومبر و دسمبر ۱۹۴۵ء میں گذری ہے، جہاں تک لفظ و

عبارت کا تعلق ہے اس بار بھی مسودہ کو شروع سے آخر تک پڑھ کر جا بجا مناسب ترمیمیں کر دی گئی ہیں، کہیں کچھ حذف، کہیں کچھ اضافہ، کہیں کچھ اور رد و بدل

معنوی حیثیت سے چاہیئے تو یہ تھا کہ طبع اوّل اور طبع سوم کے درمیانی فاصلۂ بعید کا لحاظ کر کے بہت کچھ بڑھا دیا جاتا، لیکن ایسا نہ ہو پایا۔ تغیرات صرف اتنے ہوئے ہیں کہ

(۱) فقر محمدی جو طبع دوم میں ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا تھا، اُسے اب کی ایک مستقل باب بنا دیا گیا ہے،

(۲) "مرشد کی تلاش" جو طبع دوم میں ضمیمۂ دوم تھا، ضمیمہ اب صرف اسی کو رکھا گیا ہے، ہاں اُس کے نفس مضمون پر نظر ثانی کر کے اُسے ضخیم و وسیع بہت بنا دیا گیا ہے — مرشد کی اہمیت اب نظر میں اُس درجہ میں باقی نہیں رہی، جو آج سے ۲۵ سال قبل تھی؛ اکبر الہ آبادی کا ایک شعر بھی اس سلسلہ میں یاد پڑ گیا، ؎

سچ کہا آپ نے پیری میں مریدی کیسی — تجربہ خود ہی بتا دیتا ہے مرشد اکبر

البتہ ایک رسالہ اس درمیان میں ایسا نظر پڑا کہ اگر اسکا مختصر تعارف بھی ناظرین سے نہ کرایا جائے، تو یہ اُن کے ساتھ بڑا بخل ہوگا۔ رسالہ کا نام القصد الی اللہ ہے، زبان عربی، ایک قلمی نسخہ کوئی ۲۵ سال کی مدت ہوئی نواب سالار جنگ مرحوم حیدرآبادی کے کتبخانہ میں نظر سے گذرا تھا، اور اُس کی نقل بھی اُسی زمانہ میں نواب ممدوح کی اجازت و عنایت سے حاصل ہو گئی تھی، دوسرا قلمی نسخہ مع تحت اللفظ فارسی ترجمہ کے مولانا عبد الباری مرحوم فرنگی محلی کے ہاں نظر آیا، اور اس کی نقل لے لی گئی، مصنف کی کنیت ابو القاسم ہے، اور کتاب میں جا بجا قال ابو القاسم العارفؒ آتا ہے، مصنف کا نام دونوں نسخوں میں جنید بغدادی لکھا ہوا ملا، لیکن رسالہ مشہور و معروف حضرت جنیدؒ کی تصنیف یوں نہیں کہ کتاب کے درمیان میں ایک [illegible] ہے، جو وفات حضرت جنیدؒ سے بہت بعد کا ہے اور کسی اور ذریعہ سے بھی اسکی تصدیق نہ ہو سکی کہ رسالہ انہیں معروف حضرت جنیدؒ کی تصنیف ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ محض کنیت کے اشتراک

(کہ آپکی بھی یہی کنیت ہے) اور نفس موضوع کی مناسبت سے رسالہ کے کسی ناقل نے اسے حضرت جنیدؒ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ پھر دوسرے نسخوں میں بھی وہی نقل ہوتا رہا۔ پرانے قلمی نسخوں میں اس قسم کی غلطیاں نادر نہیں،

بہر حال مصنف ابو القاسم جنید تو نہیں، البتہ کوئی دوسرے ابو القاسم تھے جو بڑے دقیقہ رس تھے بہر حال وہ جو بھی ہوں تھے وہ کوئی بڑے ہی شخص اور زمانہ غالباً چوتھی صدی ہجری کا ہی تھا کتاب کے سرسری خاکے سے بھی اندازہ ہو جائے گا، کہ تصوف و سلوک کے معنی اس زمانہ میں کیا تھے

کتاب ایک مختصر تمہید کے بعد ذیل کے دس بابوں میں تقسیم ہے:-

(۱) فی القصد الی اللہ تعالیٰ وما یستقبل من العقبات، یعنی جو اللہ کی طرف قدم اٹھاتا ہے، اُسے کن کن دشوار گذار مرحلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے،

(۲) فی ترک الوقوف من المنازل والمقامات عند القصد الیہ یعنی سالک جب قدم اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے مقامات و منازل پر رکنے نہیں دیتا، بلکہ اپنے ہی لئے خاص کر لیتا ہے۔

(۳) فی نداء الحق سبحانہ و تعالیٰ الی سر القاصدین الیہ واسمعا عہم لہ یعنی اللہ تعالیٰ سالکین کے دل میں اپنی ایسی تمنا ڈال دیتا ہے، کہ اس کے آگے ان کے دل سے ساری تمنائیں رخصت ہو جاتی ہیں۔

(۴) فی اجابۃ القاصدین نداء الحق بعد اسماعہم لہ یعنی سالکین طریق آواز حق سننے کے بعد اس کا اتباع بھی کرتے تھے)

(۵) ما ینبغی للقاصدین من التہیئ حتی یکونوا للمقصود اھلا یعنی سالکین کو کن تیاریوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن کے بعد ہی وہ یافت کے اہل ہو سکتے ہیں۔

(۶) ما ینبغی للقاصدین من رعایۃ النفس والروح والقلب یعنی سالک کو نفس و روح اور قلب کی کس حد تک رعایت ضروری ہے،

(۷) فی مشاورۃ النفس والروح والقلب فی امور القصد الی اللہ تعالیٰ یعنی

طریق میں نفس و روح و قلب کے کیا کیا درجے اور مرتبے ہیں،

(۸) القاصدین الی اللہ و صفتہم و علامات من الاشیاء یعنی سالکین طریق کے صفات و خصوصیات کا ذکر،

(۹) فی القصد الی اللہ تعالیٰ و بیان قصۃ ابی یزید یعنی اصل سلوک و حکایت بایزید سے اس پر استشہاد،

(۱۰) فی حکایت القاصدین الی اللہ تعالیٰ و قصصہم یعنی مشہور سالکین طریق کی حکایتیں،

اول کے نو بابوں میں معرفت و طریقت کے تمام تر اصول و مسائل ہیں، جنھیں بدعات مروجہ اور رسوم و مشائخ سے کوئی مناسبت ہی نہیں، بس مجاہدات کا ضبط خواہشات کا ترک لذات کا بیان ہے اور آخری باب میں حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم ادھم تک حضرات انبیاء و اولیاء کی حکایتیں درج ہیں، ــــ عرسوں اور اونچے گنبد والے مزاروں کے رواجی تصوف کا ذکر کہیں آس پاس نہیں،

جن ناظرین کرام کی نظر سے یہ رسالہ گذرے، اُن سے بمنت درخواست ہے کہ حکیم الامت اشرف العلماء حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے صوفیانہ مضامین و رسائل کا مطالعہ ضرور فرمائیں انشاء اللہ طریق سے متعلق ہر مشکل آسان ہو کر رہے گی ایسا مجدد فن مدت سے نہیں پیدا ہوا تھا حضرت کی تحریریں اس موضوع پر کوئی ایک دو نہیں چھوٹی بڑی ملا کر اُن کی تعداد پچاسوں بلکہ شاید سیکڑوں سے بھی اوپر ہے۔

آج جو بڑے بڑے اکابر فن و آئمہ طریق مشہور چلے آرہے ہیں، آیندہ تاریخ سلوک اسلامی میں انہی کی صف میں انشاء اللہ حضرت کا نام نامی بھی نظر آئے گا۔

حال کے اچھے لکھنے والوں میں ایک صاحب اور بھی ہیں، مغربی طرز کے تعلیمیافتہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم، اے، پی ایچ، ڈی، صدر شعبۂ فلسفۂ جامعہ عثمانیہ دکن، انکی

تحریریں بھی اس موضوع پر خصوصاً انگریزی تعلیم یافتوں کے حق میں آب حیات کا حکم رکھتی ہیں
عین ان سطور کی تحریر کے وقت ان کی تازہ کتاب قرآن و تصوف آئی ہوئی ہے۔

سب سے آخر میں عرض یہ ہے کہ پڑھنے والے اگر لطف و کرم سے اس کم سواد بے استعداد و عاصی و پر معاصی کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں گے تو یہ ان کی ذرہ نوازی سے بعید نہ ہوگا، اور خود ان کے لئے انشاء اللہ باعث اجر ہوگا،

جنوری ۱۹۴۷ء

دریاباد۔ بارہ بنکی

عبدالماجد

دیباچہ طبع دوم

۱۳۴۸ھ

۱۹۲۹ء

پورے پانچ سال ہونے کو آئے جب تصوف اسلام اوّل بار شائع ہوئی تھی، رب کریم کے الطاف بے کراں کا شکریہ کس زبان سے ادا کیا جائے جس نے اپنے اس ہیچمداں اور بے مایہ بندہ کی قلمی کوشش کو کامیاب بنایا اور تین ساڑھے تین برس کی مدت میں پہلے اڈیشن کو ختم کرادیا، ۱۹۲۸ء کی آخری سہ ماہی میں طبع اول کے مسودہ پر نظر ثانی، اضافہ و ترمیم کا موقع ملا، اور ۱۹۲۹ء کی آخری سہ ماہی میں اس کی اشاعت کی نوبت آرہی ہے، ذالک فضل اللہ یو تیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم ۰

طبع اول کو بعض اہل دل بزرگوں کی پیشگاہ سے خلعت قبول حاصل ہوا اور ان کی دعاؤں کی برکتیں رائگاں نہیں جاسکتیں، دوسری طرف نامور مستشرق کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر نکلسن نے بھی بہت حوصلہ افزا خیالات کا اظہار فرمایا، اور اپنے گرامی نامہ میں اس ناچیز تالیف کو "طلبۂ تصوف کے لئے ایک نہایت مفید مقدمہ" قرار دیا، وہ کریم کارساز جس ذرہ کو چاہے آفتاب بنادے اور جس بے مایہ کو چاہے سرمایہ سے مالا مال کردے، "دادِ حق را قابلیت شرط نیست" جس کسی نے کہا ہے بالکل صحیح کہا ہے،

موجودہ ایڈیشن میں مسودہ کی نظر ثانی لفظاً لفظاً کی گئی ہے، جابجا عبارتیں بدل

دی گئی ہیں، کہیں کہیں کسی مشکل لفظ کے بجائے آسان لفظ رکھ دیا گیا ہے، اکثر مقامات پر جزوی اضافے کئے گئے ہیں، اور ایک فاضل دوست کے حسب مشورہ ایک پورا باب (باب ۶) سرے سے نیا شامل کر دیا گیا ہے، ان کے علاوہ آخر میں دو مضمون اپنے ہفتہ وار سچ سے نقل کر کے بطور ضمیمہ بڑھا دیئے گئے ہیں، ممکن ہے ان کے مطالعہ سے کسی طالب کو کچھ نفع پہنچ جائے مقصد ان دونوں مقالات کا بھی وہی ہے جو ان اوراق کا ہے، یعنی صحیح اسلامی تصوف کی توضیح و تشریح، ان سب تغیرات سے قدرۃً حجم میں خاصہ اضافہ ہو گیا ہے، ظاہری ضخامت کے اضافہ کے ساتھ خدا کرے کچھ معنوی خوبیاں بھی پیدا ہو گئی ہوں۔

پچھلے سال اللہ کے فضل و کرم سے صاحب مثنوی حضرت مولانائے رومیؒ کے ملفوظات طیبات کی بھی جو اب تک غیر مطبوع اور شاید نامعلوم تھے بہ اضافہ مقدمہ و تبصرہ حواشی، طبع و اشاعت کی توفیق نصیب ہو گئی جو حضرات فارسی کی استعداد اوسط درجہ کی رکھتے ہیں اور تصوف کی تشریح اس مشہور و معروف عارف کی زبان سے نثر میں سننا چاہتے ہیں وہ شاید فیہ ما فیہ (کہ یہی اس ملفوظ کا نام ہے) کا مطالعہ اپنے لئے بے لطف و بے نفع نہ پائیں[1]۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ؕ

دریاباد - بارہ بنکی
ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ
۱۹۲۹ء

عبد الماجد

---

[1] اس کے کئی سال بعد فیہ ما فیہ کا ایک بہت عمدہ اور ہر حیثیت سے بہتر ایڈیشن ڈاکٹر فروزان فر، ڈائرکٹر تعلیمات ایران نے ایران سے شائع کیا۔

دیباچہ طبع اوّل

۱۹۲۴ء

اسلام خدا کی طرف سے بندوں کے حق میں کامل ترین وجامع ترین پیام رحمت ہے، انسان کے ذہنی وعقلی، اخلاقی ومعاشری، جسمانی وروحی، انفرادی واجتماعی تمام ضرورتوں کا کفیل اور ہر شعبۂ حیات میں ترقیوں کا ضامن، خدا رسی وخدا شناسی کی تعلیم اس کا اصل مقصود تھی، اس پر اس نے خاص طور سے زور دیا، اور اس کے ذرائع ووسائل اس نے اس جامعیت کے ساتھ بیان کئے کہ ان میں کسی قسم کے تغیر وترمیم تخفیف واضافہ کی گنجائش نہ چھوڑی،

مسلمانوں میں ابتداء سے ایک گروہ ایسا موجود ہے جس نے تمام مقاصد دنیوی سے قطع نظر کرکے اپنا نصب العین محض یاد خدا و ذکر الٰہی کو رکھا، اور صدق وصفا، سلوک و احسان کے مختلف طریقوں پر عامل رہا،

شروع شروع یہ گروہ دوسرے ناموں سے ملقب رہا، ایک طویل عرصہ گذرجانے کے بعد رفتہ رفتہ اسکے مسلک کا نام "تصوف" پڑگیا، اور یہ گروہ "گروہ صوفیہ" کہلانے لگا، اصطلاح "تصوف" کب سے رائج ہوئی؟ اس بحث کا یہاں موقع نہیں، نہ اس لفظ کے اشتقاق اور اس کی تحقیق لغوی کو اس وقت بیان کرنا مقصود ہے، یہاں کہنا صرف یہ ہے کہ اس گروہ کے اکابر قدیم پہلے مسلمان تھے، پھر صوفی، وہ تصوف کو اسلام کے مقابل ایک جداگانہ مسلک کی حیثیت سے نہیں لاتے تھے، بلکہ اسلام کے تحت، اسی کی پاکیزہ

ترین صورت کو کہتے تھے، وہ اپنے اسلام کو، اپنے تصوف پر مقدم رکھتے تھے، اور تصوف کو محض اس لئے عزیز و محبوب رکھتے تھے کہ وہ اُن کی نظر میں اسلام کی خالص ترین و پاکیزہ ترین تعبیر تھی،

صفحات آئندہ میں بعض قدیم اکابر صوفیہ رحمۃ اللہ علیہم کی اصل تصانیف کی مدد سے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان حضرات کے نزدیک تصوف کا مفہوم محض اس قدر تھا کہ اتباع کتاب و سنت میں انتہائی سعی کیجائے، اسوہ رسولؐ و صحابہؓ کو دلیل راہ رکھا جائے، اوامر و نواہی کی تعمیل کیجائے، طاعات و عبادات کو مقصود حیات سمجھا جائے، قلب کو محبت و تعلقِ ماسوا سے الگ کیا جائے، نفس کو خشیت الٰہی سے مغلوب کیا جائے اور صفائے معاملات و تزکیہ باطن میں جہد و سعی کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ ہونے پائے،

حضرت شیخ جیلانیؒ بلکہ ان کے مرید با اختصاص اور بانی سلسلہ سہروردیہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی تک کی تصانیف میں یہ اسلامی عنصر قائم، اور یہی رنگ غالب ہے، اس زمانہ کے بعد شیخ ابن عربیؒ کے اثر سے نظام تصوف میں فلسفیانہ عنصر کو غلبہ ہونے لگا، وحدت وجود وغیرہ کے مسائل پیدا ہونے لگے، اور فارسی شاعری کے اثر سے ان تخیلات کو اور تقویت ہوتی گئی، چنانچہ ملا جامیؒ کی لوائح (جیساکہ آگے چل کر اسی کے تبصرہ کے ذیل میں ظاہر ہو گا) ایک اچھی خاصی فلسفیانہ تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے، تاہم نویں صدی کا یہ تصوف بھی اگرچہ ابتدائی صدیوں کے تصوف سے بہت کچھ منحرف ہو چکا تھا، ان رسم پرستیوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، جس پر آج اکثر خانقاہوں اور درگاہوں میں تصوف کا اطلاق ہوتا ہے۔

تصوف کی موجودہ مسخ شدہ شکل یونانی اوہام، ایرانی تخیلات، ہندی مراسم اور دیگر غیر اسلامی عناصر کا ایک معجون مرکب ہے، جس کے صرف بعض اجزاء اسلامی کہے جا سکتے

ہیں، اور وہ بھی بڑی تلاش و دیدہ ریزی کے بعد نظر آتے ہیں، حاشا ثم حاشا یہ اسلامی تصوف نہیں، اسلامی تصوف وہ تھا جو خود حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، جو ابوبکر صدیقؓ و علی مرتضیٰؓ کا تھا، جو سلمانؓ و ابوذرؓ کا تھا جس کی تعلیم جنید بغدادیؒ اور حسن بصریؒ نے دی ہے، جس کی ہدایت شیخ جیلانیؒ و شیخ سہروردی و خواجہ اجمیریؒ و محبوبؒ دہلوی و خواجہ نقشبندیؒ و مجدد سرہندیؒ کرتے رہے، اور جس کی دعوت اس دورِ آخر میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی زبان قلم دیتی رہی،

خواجہ معین الدین اجمیری سلسلۂ چشتیہ کے مسلم مقتدا ایسے بزرگ گذرے ہیں ملفوظاتِ مبارک کا مجموعہ دلیل العارفین کے نام سے خواجہ قطب الدین بختیارؒ کا فراہم کیا ہوا شائع ہو چکا ہے، رسالۂ مذکور اول سے آخر تک نماز و عبادات کی تاکید اور اتباع سنت رسولؐ کے فضائل سے لبریز ہے، وضو وغیرہ کے بعض معمولی سنن کی پابندی پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ آج اکثر دن کو فرائض میں اس کا نصف اہتمام بھی نصیب نہیں، اور اس باب میں اس سے بھی زیادہ قابل ذکر بانی سلسلۂ عالیہ قادریہ محبوب سبحانی حضرت شیخ جیلانیؒ کی کتاب غنیۃ الطالبین ہے، جو شروع سے آخر تک بجائے کسی درویش و صوفی کے ٹھیٹھ فقیہ اور عالم شریعت کی فقہی تالیف نظر آتی ہے،

سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے ایک اور گوہر درخشاں خواجہ نظام الدین محبوب الٰہیؒ دہلوی تھے جن کے ملفوظات میں سب سے زیادہ معتبر رسالہ فوائد الفواد مرتبہ (امیر حسن علاء سنجریؒ) اور حالات و سوانح میں (رسالہ سیر الاولیاء مرتبہ میر خوردؒ دہلوی) موجود ہیں، ان رسائل کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

"بندہ را پیش طلبید و فرمود کہ باید کہ مشغول پیوستہ بہ طاعت و عبادت باشی"۔
صـــ۲۲ (فوائد الفواد مطبوعہ نول کشور)

"حکایت جماعت متحیران افتاد ... ... یکے از حاضران حکایت کرد کہ

من و نفتے جائے اسلام وایں چنیں ہفت کس را دیدم دو چشم در آسمان داختہ، شب و روز متحیر ماندہ، مگر آنکہ وقت نماز درمی آمد، ایشاں نماز می گذاردند دباز، ہمچناں متحیر می ماندند، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کے آرے انبیا معصوم اند و اولیاء محفوظ ہمچنیں باشد، کہ گفتی۔ اگرچہ شب و روز متحیر باشند، اما نماز ایشاں فوت نہ شود (صفحہ ۱۴۴ ایضاً)

"چوں عمر عزیز سلطان المشائخ بہ ہشتاد کشید، شیخ وقت نماز بجہت جماعت از بالائے بام جماعتخانہ کہ عمارتے بس رفیع است فرود آمدے، دبا درویشان و عزیزاں کہ دراں جمع ملکوت حاضر می شدند نماز گذاردے (سیر الاولیاء صفحہ ۱۲۴)

اکابر چشتیہ کی زندگیاں، صحیح تصوف اسلامی کا نمونہ تھیں، تفصیل کسی مناسب موقع پر بیان ہوگی،

عہد نبوت سے تقریباً ایکہزار سال گذرنے پر شیخ احمد سرہندی پیدا ہوئے جنھوں نے نہ صرف سلسلۂ نقشبندیہ بلکہ تمام سلاسل تصوف میں تجدید و اصلاح کا صور اس بلند آہنگی کے ساتھ پھونکا کہ اس کی صدائے باز گشت آج تک دنیائے اسلام کے در و دیوار سے آرہی ہے شیخ موصوف رح کے مکتوبات کے ضخیم دفتر ملک میں شائع ہو چکے ہیں، ان میں شروع سے آخر تک مختلف اسلوبوں اور پیرایوں میں ایک ہی دعوی کی تکرار، ایک دینی دعوت کا اعادہ ہے، اور وہ یہی ہے کہ صوفیہ کو عقائد و اعمال ہر شے میں کتاب و سنت ہی کو اپنا دلیل راہ بنانا چاہیئے، اور اس کے خلاف جس کسی کے بھی اقوال ہوں انھیں مردود سمجھنا چاہیئے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں،

"بدانکہ از جملۂ ضروریات طریق سالک اعتقاد صحیح است کہ علمائے اہل سنت آں را از کتاب و سنت و آثار سلف استنباط فرمودہ اند...... واگر بالفرض

خلاف آں معانی مفہومہ بکشف و الہام امرے ظاہر شود آں را اعتبار نباید کرد
از آں استعاذہ باید نمود (مکتوبات مجددی حصہ ۵ صفحہ ۴۲ مطبوعہ امرتسر)
شریعت را صورتے است و حقیقتے، صورتش آن است کہ علماء ظواہر
بہ بیان آں متکفل اند و حقیقتش آں کہ صوفیہ علیہ بآں ممتاز اند" (حصہ ۳ صفحہ ۵۰)
انچہ برما فقیراں لازم است دوام ذل است و افتقار و انکسار و تضرع
و التجاء و ادائے وظائف عبودیت و محافظت حدود شرعیہ و متابعت
سنت سنیہ (حصہ ۳ صفحہ ۵۶)

"ولایت را درجات اند بعضہا فوق بعض، زیرا کہ بر قدم ہر نبی ولایت
است مخصوص بآں و انتہائے درجات آں ہماں درجہ ایست کہ بر قدم
پیغمبر ماست .... و ازیں مقام عزیز الوجود نصیب کامل و حظ وافر حاصل
است ہر مکمل تابعانِ آں سرور را علیہ الصلوٰۃ والسلام پس لازم گیرید متابعت
آنحضرت را صلعم اگر شما یاں تحصیل ایں دولت قصوی و تکمیل ایں درجہ علیا
متوجہ اید (حصہ اوّل صفحہ ۴۷)

"محمد رسول اللہ محبوب رب العالمین است، ہر چیز کہ خوب و مرغوب
است برائے مطلوب و محبوب است لہٰذا حق سبحانہ تعالیٰ در کلام مجید خود می
فرماید اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ، و نیز می فرماید تعالیٰ و تقدس اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ
عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ و نیز فرمودہ تعالیٰ و تقدس، اَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا
فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ او را علیہ الصلوٰۃ والسلام صراط مستقیم خواندہ و
ماسوائے او را داخل سبل گردانیدہ و اتباع آں منع فرمودہ ....
باطن متمم ظاہرات و مکمل آں سر موے باہم دگر مخالفت ندارد ...... پس
سالکان سلسلہ طریقت و حقیقت را اگر در اثنائے راہ امورے کہ بظاہر با شریعت

درجنگ اند ظاہر شوند و ظاہر سازند مبنی بر سکر وقت و غلبہ حال است، اگر از آں مقام گذرانند و بہ صحو آرند آں منافات بالکلیہ مرتفع می شوند و آں علوم متضادہ بہ تمام ہباءً منثوراً می گردند" (ایضاً ص ۲ عت ۳۰۲)

مکتوبات مجددی کی ایک ایک سطر اسی تعلیم محمدی سے لبریز ہے۔ دور آخر میں یہی دعوت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی متعدد تصنیفات وصایا، القول الجمیل، حجۃ اللہ البالغۃ، الفوز الکبیر وغیرہ کے ذریعہ سے پیش کی، نیز ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے اپنی ملفوظات، فتاوی و اجزائے تفسیر کے اوراق میں اور آج بھی یہی پیام زیادہ مرتب و منظم صورت میں خانقاہ امدادیہ اشرفیہ (تھانہ بھون) کے در و دیوار سے مل رہا ہے۔

اس رسالہ کو افسوس ہے کہ بعض وجوہ سے بہت ہی مختصر لکھنا پڑا۔ خدائے پاک و برتر اس حقیر خدمت کو قبول فرمائے اور دور حاضر کے مسلمانوں کو صحیح اسلامی تصوف کے سمجھنے اور اس کے اختیار کرنے کی توفیق نصیب کرے۔

دریاباد۔ بارہ بنکی
۲۱ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ
۱۹۲۴ء

عبدالماجد

(۱) کتاب اللّمع

از شیخ ابو النصر سرّاج

(الف) مصنف[1]

پورا نام عبداللہ بن علی بن محمد بن یحییٰ ابو النصر سراج تھا لقب طاؤس الفقراء وطن طوس تھا، مرقد بھی یہیں ہے، آباؤ اجداد زہد میں شہرت رکھتے تھے، کان ابو النصر من اولاد الزھاد (تاریخ الصوفیہ للسلمی)

خود سرّاج علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے، کان المنظور الیہ فی ناحیتہ فی الفتوۃ ولسان القوم مع الاستظہار بعلم الشریعۃ، وھو فقیہ حتیٰ اعنھم الیوم (ایضاً)

"در فنون علم کامل بود" (تذکرۃ الاولیاء عطارؒ)

ماہ رجب ۳۷۸ھ (اکتوبر یا نومبر ۹۸۸ء) میں حالت نماز میں وفات پائی۔ ایک چلی ہوئی روایت کے مطابق وفات سے قبل فرمایا کہ جس میت کو میرے مزار کے سامنے سے لے کر نکلیں گے اس کی مغفرت ہو جائے گی۔ صدیوں بعد کے

---

[1] ماخذ:- (۱) تذکرۃ الاولیاء عطارؒ ۲ جلد (مطبوعہ لیڈن) (۲) نفحات الانس جامی (کلکتہ) (۳) سفینۃ الاولیاء شہزادہ دارا شکوہ (لکھنؤ) (۴) مقدمہ کتاب اللمع پروفیسر نکلسن (لیڈن) کشف المحجوب، شیخ علی ہجویری (لاہور)

تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ طوس میں، اب تک یہ دستور چلا آتا ہے کہ ہر جنازہ کو پیشتر ان کے مزار پر لاتے ہیں،

استادوں میں جعفر الخلدی (المتوفی ۳۴۸ھ) ابوبکر محمد بن داؤد الدقی (المتوفی ۳۶۰ھ) اور احمد بن محمد سایح کے نام لئے گئے ہیں، بیعت کی روایت ابو محمد مرتعش نیشاپوری سے کی گئی ہے، ان کا سال وفات ۳۲۸ھ ہے، ان کا ذکر تو کتاب میں کوئی پانچ بار آیا ہے، لیکن ان کے مرشد ہونے کا کہیں اشارہ نہیں، ملاقات سریؒ سقطی اور سہل تستریؒ سے بھی بیان کی گئی ہے، گو اول الذکر کا سال وفات ۲۵۳ھ اور آخر الذکر کا ۲۸۳ھ ہے، واللہ اعلم،

تصوف پر متعدد کتابیں تصنیف کیں، ملا جامی کے الفاظ ہیں "وے را تصانیف بسیار است"۔ (نفحات الانس) لیکن آج بجز کتاب اللمع کے اور کوئی بظاہر موجود نہیں، بلکہ ان کے نام تک بھی معلوم نہیں،

تصوف و معرفت میں جو پایہ رکھتے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شیخ فرید الدین عطارؒ جو خود شیخ الکل کا حکم رکھتے ہیں، ان کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"آں عالم عارف، آں حاکم خائف آں امین زمرۂ کبراء، آں نگیں حلقۂ فقراء آں زبدۂ اشباح، شیخ ابو النصر سراج رحمۃ اللہ علیہ امامے بر حق بود و یگانۂ مطلق و متعین و متمکن و او را طاؤس الفقراء گفتندے، و صفت و نعت او زاں چنداں ست کہ در قلم و بیان آید و یا در عبارت و زبان گنجد و در فنون علم کامل بود و در ریاضت و معاملات شانے عظیم داشت، در حال و قال و شرح دادن بر کلمات مشایخ آیتے بود"

ایسے ہی الفاظ جامی وغیرہ بھی لائے ہیں،

چند ارشادات و واقعات جو تذکروں میں محفوظ رہ گئے ہیں ان سے بھی اہل ذوق

ان کے مرتبۂ کمال کو کچھ نہ کچھ تو جان ہی سکتے ہیں،

فرماتے تھے عشق اس آگ کا نام ہے جو عاشقوں کے دل اور سینہ میں جلتی رہتی ہے، اور اللہ کے سوا جو کچھ ہے، اسے جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

یہ بھی ارشاد تھا کہ بہ لحاظ ادب انسانوں کے تین طبقے ہیں، ایک طبقہ اہلِ دنیا کا ہے کہ اس کے نزدیک ادب، فصاحت و بلاغت و حفظ علوم و فنون و اسماء ملوک و اشعار عرب کا نام ہے، دوسرا طبقہ اہلِ دین کا ہے، اس کے نزدیک ادب سے مراد عبادت جوارح و حفاظت حدود و ترک شہوات و ریاضت نفس ہے، تیسرا طبقہ اہلِ خصوص کا ہے، اس کے ہاں ادب سے مفہوم، طہارت قلب، مراعات سر، وفائے عہد، نگہداری وقت، نیکو کرداری وقت حضور و مقام قرب ہے،

ایک تیسرا ارشاد ہے، اسے اصل فارسی ہی میں سنیئے، الفاظ کی نزاکت شاید اردو ترجمہ کی متحمل نہ ہو سکے،

"نسبت بخدا است و از خدا و برائے خدا است، و آنا تے کہ در نماز اقتدا از نیت اقتدا اگرچہ بسیار بود آں را موازنہ نتواں کرد با نسبتے کہ خدا را بود و بخدا اے بود"

ایک بار ماہ رمضان میں بغداد میں وارد ہوئے اور مسجد شونیزیہ کے ایک حجرہ میں معتکف ہوئے، درویشوں نے متفق ہو کر نماز میں اپنا امام بنایا، ماہ مبارک کی تراویح میں پانچ بار قرآن مجید ختم کیا، اسی سے ظاہر ہے کہ حافظ قرآن، اور تراویح میں سنانے کے عادی تھے، روزانہ افطار کے وقت خادم ایک روٹی حجرہ میں پہنچا آتا تھا، عید کی نماز پڑھا کر بغداد سے روانہ ہو گئے، خادم نے حجرہ میں جا کر دیکھا تو پوری روٹیاں جوں کی توں رکھی ہوئی پائیں، خدا معلوم کیا کھا کر پورا رمضان گذارا،

ایک مرتبہ سردی کے موسم میں شب کے وقت آتشدان کے قریب تشریف فرما تھے،

چند اور اہل دل حضرات بھی تھے، گفتگو معرفت الٰہی پر ہو رہی تھی دفعتہً شیخ پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی، اور جوش میں آکر دہکتی ہوئی آگ میں سجدہ میں گر پڑے، مریدین خوف زدہ ہو کر باہر بھاگ گئے، دوسرے روز آئے تو دیکھا کہ چہرہ چاند کی طرح چمک رہا ہے، اور جلنے کا کہیں خفیف داغ تک نہیں، عرض کی، حضور والا، یہ کیا ماجرا ہے ہم تو سمجھ رہے تھے کہ سارا چہرہ جل گیا ہوگا، ارشاد ہوا کہ "جس نے درگاہِ الٰہی پر اپنی آبرو دے دی، اس کے چہرہ کو آگ نہیں جلا سکتی"۔

(فارسی فقرہ کی جان لفظ "آبرو" ہے اردو ترجمہ میں اس کا لطف منتقل نہیں ہو سکتا)

تذکروں میں اور روایتیں کراماتی قسم کی اس سے بڑھ بڑھ کر لکھی ہوئی ہیں، یہاں صرف دو نقل کر دی گئیں،

شیخ نے معلوم ہوتا ہے سیاحی خوب کی تھی، اور اسلامی دنیا کے دور دراز علاقوں کے سفر کر ڈالے تھے، کم از کم اتنے مقامات کے نام تو اسی کتاب میں مل جاتے ہیں، بصرہ، ربذہ، مکہ، بغداد، رملہ، دمشق، الطیوخ، قاہرہ، بیت المقدس، بسطام، تستر، تبریز گویا حجاز، ایران، عراق، شام، مصر، طرابلس ایشیائے کوچک کے سفروں میں تو شبہ ہی نہیں۔

(ب) تصنیف

یہ علم تو نہیں کہ کتاب کس سنہ میں، اور مصنف کے کس سن میں تصنیف ہوئی، لیکن مصنف کا سنہ وفات ۳۷۸ھ ہے، اس سے ظاہر ہے کہ کتاب چوتھی صدی ہجری کے وسط کی پیداوار ہے، اور اس لئے اللمع کا شمار بجا طور پر تصوف کی قدیم ترین کتابوں میں ہے۔

آج سے ۴۰ سال قبل دنیا کتاب اللمع کے صرف نام سے آشنا تھی، ۱۹۰۹ء میں کیمبرج یونیورسٹی (انگلستان) کے استاذ فارسی اور عاشق کتب تصوف ڈاکٹر نکلسن نے دو قلمی نسخے کھوج نکالے، ایک نسخہ ۶۸۳ھ کا لکھا ہوا اور دوسرا ۵۴۸ھ کا، پانچ سال کی دیدہ ریزی کے بعد دونوں نسخوں کا مقابلہ کرکے پروفیسر موصوف نے اصل کتاب کو غایت اہتمام کے ساتھ ۱۹۱۴ء میں شائع کر دیا، اور متعدد مفید اضافے بھی کئے مثلاً شروع میں مفصل فہرست مضامین، آخر میں مبسوط فہرست رجال و نساء اماکن و قبائل و کتب وغیرہا، اور بہ کثرت حواشی، اور انگریزی میں ملخص ترجمہ وغیرہ،

ان معنوی خصوصیات کے ساتھ کاغذ، طباعت وغیرہ کے حسن ظاہری کے لوازم کو بھی ملحوظ رکھا، اور کتاب لیڈن کے ریل (BRILLE) پریس سے چھاپ کر کے شائع کر دی، کتاب کا پورا نام کتاب اللمع فی التصوف ہے "ملا جامی" نے نام کا املا کتاب اللمعہ (باضافہ ہائے ہوز) درج کیا ہے لیکن اصل کتاب کے نسخوں میں یہی املا ہے۔

کتاب کی ضخامت ۴۳۶ صفحے کی ہے، اور ایک مقدمہ اور ۱۳ حصوں میں تقسیم ہے، مقدمہ (صـ۱-۴۰) اس قسم کے مباحث پر شامل ہے:

باب البیان عن علم التصوف،

باب فی نعت طبقات الحدیث،

باب الکشف عن اسم الصوفیہ،

باب اثبات علم الباطن،

باب التصوف ما ہو،

باب التوحید و صفۃ الموحد

ان ضروری تمہیدی اور تعارفی مسائل کے بعد کتاب بالکل صحیح منطقی ترتیب کے ساتھ حسب ذیل حصوں میں تقسیم ہوتی ہے۔

(۱) کتاب الاحوال و المقامات (ص ۴۱-۷۱)

"حال" و "مقام" صوفیہ کے ہاں کی اہم اصطلاحیں ہیں، چنانچہ اس حصہ میں مقامات احوال اور ان کے حقائق میں سے ہر شے پر الگ الگ ایک ایک باب میں بحث کی ہے، مثلاً باب مقام التوبہ، باب مقام الورع، باب مقام الزہد، باب مقام الصبر، باب مقام التوکل، باب حال الخوف، باب حال المحبۃ، باب حال الشوق، باب حال البشارۃ و قس علیٰ ہذا،

(۲) کتاب اہل الصفوۃ فی الفہم و الاتباع لکتاب اللہ (ص ۷۲-۹۲)

مبادی کی تشریح کے بعد آغاز کلام قدرۃً کتاب اللہ سے ہوتا ہے اور اس کے تحت میں اس قسم کے ابواب ہیں:

باب الموافقۃ بکتاب اللہ، باب ذکر نعوت المستمعین خطاب اللہ تعالیٰ باب وصف ارباب القلوب فی فہم القرآن، باب ذکر السابقین والمقربین والابرار من طریق الفہم والاستنباط وغیرہا،

(۳) کتاب الاسوۃ و الاقتداء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، (ص ۹۲-۱۰۴)

"کتاب" کے بعد "سنت" کا ذکر قدرتاً آنا چاہیے، اور یہی ہوا، اس کے تحتانی

عنوانات اس قبیل کے ہیں،

باب وصف اہل الصفوۃ فی الفہم والموافقۃ والاتباع للنبی صلعم، باب ما روی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اخلاقہ وافعالہ واحوالہ التی اختارہا اللہ تعالیٰ، باب ما ذکر عن المشائخ فی اتباعہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، وتخصیصہم فی ذالک وغیرہا۔

(۴) کتاب المستنبطات (ص۱۰۵ تا ص۱۱۸)

قرآن وحدیث یا کتاب وسنت کے نصوص کے بعد ایک مومن کے لئے ترتیباً اب ان احکام وشعائر کا ذکر آنا چاہیئے، جو انہی پر مبنی، متفرع یا انہی سے ماخوذ ومستنبط ہوں، چنانچہ عین اسی فطری ترتیب کے مطابق چوتھے نمبر پر یہ حصہ ہے، اس کے ذیل میں اس قسم کے مباحث مندرج ہیں،

باب مذاہب اہل الصفوۃ فی المستنبطات الصحیحۃ فی فہم القرآن والحدیث، باب فی کیفیۃ الاختلاف فی مستنبطات اہل الحقیقہ فی معنی علومہم واحوالہم، باب فی مستنبطاتہم فی معانی اخبار وبیۃ عن رسول اللہ صلعم طریق الاستنباط والفہم وغیرھا،

(۵) کتاب الصحابۃ رضوان اللہ علیہم (ص۱۱۹-۱۲۰)

رسول کے بعد ایک مومن کے لئے مقدس ترین ہستیاں صحابہ کرامؓ کی ہیں، اور قدیم صوفیہ کرام سنت نبوی کے بعد آثار صحابہ ہی کو اپنے لئے دلیل راہ جانتے تھے، اس لئے قدرۃً ایک مستقل حصہ ان کی نذر ہے، اس کے ذیلی ابواب میں خلفائے اربعہؓ پر، اصحاب صُفّہؓ پر، عام اصحاب نبوی پر، سب پر الگ الگ گفتگو ہے، اور حضرت صدیقؓ کا تذکرہ تخصیص وتفصیل دونوں کے ساتھ ہے۔

(۶) کتاب آداب المتصوفہ (ص۱۴۱-۲۱۰)

اس کے تحتانی ابواب کے چند عنوانات یہ ہیں،

باب ذکر آدابہم فی الوضوء والطہارۃ، باب ذکر آدابہم فی الزکوٰۃ والصدقات، باب فی ذکر الصوم وآدابہم فیہ، باب ذکر آدابہم فی الحج، باب ذکر آدابہم عند مجالسۃ العلماء باب ذکر من آدابہم فی وقت الطعام باب فی ذکر آدابہم فی وقت السماع والوجود باب فی ذکر آدابہم فی اللباس، باب فی ذکر آدابہم عند الموت،

یہ حصہ کتاب کے طویل ترین حصوں میں سے ہے، اور اس میں صوفیہ کے آداب، زندگی سے موت تک، ہر ہر شغل اور وقت کے درج ہیں،

(۷) کتاب المسائل واختلاف اقاویلہم فی الاجوبۃ (صفحہ ۲۱۱-۲۳۱)

اس حصہ میں صوفیہ کرام کی زبان سے ان سوالات کے جوابات دئے ہیں جن کا حل کرنا فقہا اور علماء ظاہر کے دائرہ سے باہر ہے، شلاً جمع وتفرقہ، فنا وبقا، مسئلہ صدق، مسئلہ اخلاص، مسئلہ روح،

اس حصہ کو مختلف بابوں میں تقسیم نہیں کیا ہے، بیان مسلسل ہے،

(۸) کتاب المکاتبات والصدور والاشعار والدعوات والرسائل (صفحہ ۲۳۲-۲۶۶)

اس حصہ میں (جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے) حضرات صوفیہ کے مکتوبات، رسائل، اشعار، دعوات ووصایا کا ذکر کیا ہے، اور ہر ایک کو ایک ایک علیحدہ باب میں لکھا ہے،

(۹) کتاب السماع (صفحہ ۲۶۷-۲۹۹)

صوفیہ اور علمائے ظاہر کے درمیان اور خود صوفیہ میں باہم ایک اہم اختلافی موضوع مسئلہ سماع ہے، یہ حصہ اسی مسئلہ کی توضیح وتشریح کے لئے وقف ہے، اس کے ماتحت چند عنوانات یہ ہیں:-

باب فی حسن الصوت والسماع وتفاوت المستمعین، باب فی وصف سماع العامۃ واباحۃ ذالک، باب فی وصف سماع الخاصۃ وتفاضلہم فی ذالک، باب فی ذکر طبقات المستمعین، باب فی وصف سماع المریدین والمبتدئین، باب فی وصف

نفوس الخصوص واهل الکمال فی السماع،

(۱۰) کتاب الوجد (صفحہ ۳۰۰-۳۱۴)

وجد و حال بھی تصوّف کا ایک جز شروع سے سمجھا گیا ہے اس حصہ کے مباحث کا اندازہ ابواب تحتانی کے ان عنوانات سے ہوگا۔

باب فی ذکر اختلافہم فی ماہیۃ الوجد، باب فی صفات الواجدین باب فی ذکر تواجد المشائخ الصادقین، باب فی الواجد الساکن الواجد المتحرک

(۱۱) کتاب اثبات الآیات و الکرامات (صفحہ ۳۱۵-۳۳۲)

کراماتِ اولیاء کا صحیح مفہوم، ان کے اثبات کے دلائل، معجزاتِ انبیاء سے ان کا فرق یہ سب مباحث بھی ضروری تھے، اور وہ اس حصہ میں آگئے۔ عنواناتِ ابواب کا نمونہ یہ ہے:۔

باب فی معانی الآیات والکرامات باب فی الادلۃ علی اثبات الکرامات الاولیاء باب فی ذکر مقامات اہل الخصوص فی الکرامات،

(۱۲) کتاب البیان عن المشکلات (صفحہ ۳۳۳-۳۷۴)

اس حصہ میں کل دو باب ہیں، پہلے باب میں اُن الفاظ کو جمع کر دیا ہے، جو صوفیہ کی زبان میں مخصوص اصطلاحی معنی رکھتے ہیں، شلاً حال، مقام، مکان، وقت، مشاہدہ، سر، کشف، فنا، بقا، توحید، تجرید وغیرہا، اور دوسرے باب میں ان اصطلاحات کی تشریح کی ہے،

(۱۳) کتاب تفسیر الشطحیات والکلمات التی ظاہرہا مستشنع و باطنہا صحیح مستقیم، (صفحہ ۳۷۵-۴۴۳)

یہ کتاب کا آخری حصہ ہے، جو حصۂ مقتدم کی طرح پوری طرح تفصیل سے لکھا گیا ہے، اس میں شطحیاتِ صوفیہ کی توجیہ و توضیح ہے، نیز ان غلط فہمیوں کی اصلاح جن میں اکثر علمائے ظاہر و صوفیۂ ناقص مبتلا رہتے ہیں، چند ابواب کے عنوانات یہ ہیں:

باب فی معنی الشطح، باب تفسیر العلوم وبیان ما یشکل علی فہم العلماء من علوم الخاصة وتصحیح ذالک بالحجة، باب فی کلمات شطحیات تحکی عن ابی یزید، باب فی ذکر ابی الحسن النوری، باب فی ذکر من غلط فی الاحوال، باب فی ذکر من غلط فی فناء البشریة، باب فی ذکر من غلط فی الانوار، باب فی ذکر من غلط فی الروح، وغیرہا،

عنوانات ہی پر ایک سرسری نظر کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ تصوف سے متعلق جتنے ضروری پہلو نکل سکتے ہیں مصنف نے ان میں سے کسی کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا ہے، ہر ضروری شعبہ کو لیا ہے، اور اس پر تفصیل اور تحقیق سے گفتگو کی ہے، زبان وانداز بیان میں بھی خاص سلاست وسادگی ہے، یہاں تک کہ جو (راقم السطور کی طرح) عربی زبان میں مبتدی ہیں، وہ بھی مطالب کتاب سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

اب ذیل میں کتاب کے مختلف مقامات سے اقتباسات دیے جاتے ہیں جن سے مرتبۂ تصنیف اور نوعیت مسائل دونوں کا پورا اندازہ ہو سکے گا:

پہلا سوال ایک غیر صوفی کے دل میں یہ پیدا ہوتا ہے، کہ تصوف آخر ہے کیا شے؟ اور اسلام نے آیا تصوف اور صوفیہ کا کوئی مرتبہ تسلیم کیا ہے؟ حضرت مصنف اس کے جواب میں قرآن مجید کی آیت شہد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو والملائکۃ واولوا العلم قائماً بالقسط (آل عمران، آیت ۹۸) پیش فرما کر لکھتے ہیں:

ذکر اللہ تعالیٰ فضل المؤمنین عندہ درجة واعلاهم فی الدین رتبة ذکرهم بعد ملائکة شهد علی شهادتهم له بالوحدانیة بعد ما بدأ بنفسه وثنی بملائکته فقال عز وجل شهد الله انه

اللہ تعالیٰ نے تمام مومنین سے بلند و برتر مرتبہ ان کا رکھا ہے جو اولی العلم اور قائمین بالقسط ہیں، اور ملائکہ کے بعد انہی کی شہادت پیش کی ہے چنانچہ فرمایا شہد اللہ الخ اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی علماء کو جانشین انبیاء

لا اله الا هو والملائكة واولوا العلم
قائماً بالقسط وروي عن النبي صلعم
انه قال العلماء ورثة الانبياء وعندي
والله اعلم ان اولي العلم القائمين
بالقسط الذين هم ورثة الانبياء
هم المعتصمون بكتاب الله تعالى
المجتهدون في متابعة رسول الله
صلعم المقتدون بالصحابة والتابعين
السالكون سبيل اولياء الله المتقين و
عباده الصالحين هم ثلثة اصناف
اصحاب الحديث والفقهاء والصوفية
فهؤلاء الثلثة الاصناف هم اولي العلم
القائمين بالقسط الذين هم
ورثة الانبياء (صفحہ ۵)

ارشاد فرمایا ہے سو یہ القاب
میرے خیال میں ان لوگوں کے
حق میں وارد ہوئے ہیں، جو کتاب
اللہ کا سررشتہ مضبوط تھامنے والے
اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی
متابعت کے پورے کوشاں اور صحابہ
اور تابعین کے نقش قدم پر چلنے والے
اور اللہ کے اولیاء متقین وصالحین
کی راہ اختیار کرنے والے ہیں، اور
ایسے اشخاص کو طبقات سہ گانہ میں
رکھا جا سکتا ہے، ایک طبقہ ارباب حدیث
کا ہے دوسرا فقہا کا، اور تیسرا صوفیہ کا
بس یہی طبقات سہ گانہ اولوا العلم اور
قائم بالقسط کہے جانے کے مستحق ہیں، جو
انبیاء کے جانشین ہوتے ہیں۔

بہت سے امور تو صوفیہ اور محدثین و فقہا کے درمیان مشترک ہی ہوتے ہیں، جو
عقائد ان کے ہوتے ہیں وہی ان کے بھی کتاب اللہ اور سنت نبوی کی پیروی یہ اور
وہ دونوں اپنے لئے واجب سمجھتے ہیں، علوم و فنون سے جس طرح وہ کام لیتے ہیں یہ
بھی کام لیتے ہیں، وقس علی ہذا،

ثم انهم من بعد ذالک ارتقوا
الی درجات عالیة وتعلقوا باحوال

لیکن اس اشتراک کے بعد صوفیہ
انواع عبادات، حقایق طاعات

شریفۃ ومنازل رفیعۃ من انواع العبادات وحقائق الطاعات والاخلاق الجمیلۃ ولہم فی معانی ذالک تخصیص لیس لغیرہم من العلماء والفقہاء واصحاب الحدیث	اور اخلاق جمیلہ سے جن درجات عالیہ اور منازل رفیعہ کو طے کر لے لگتے ہیں، وہاں تک علماء ظاہری اور فقہاء اور اصحاب حدیث کی رسائی بھی نہیں ہو سکتی، (صفحہ ۱۱)

صوفیہ کے امتیازی خصوصیات جن میں دوسرے طبقات ان کے ساتھ شریک نہیں، اُن میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی توحید بالکل خالص ہوتی ہے غیر اللہ سے وہ کسی صورت بھی دل نہیں اٹکاتے ان کی لو صرف اللہ سے لگی رہتی ہے

اوّل شیئ من الخصوصیات للصوفیۃ ۔۔۔۔ ترک ما لا یعنیہم وقطع کل علاقۃ تحول بینہم وبین مطلوبہم ومقصودہم اذ لیس لہم مطلوب ولا مقصود غیر اللہ تعالیٰ (ص ۱۱)	صوفیہ کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ ہی پر نظر رکھتے ہیں، ان کا مطلوب ومقصود تمام تر اللہ ہی ہوتا ہے، ماسوا اور لایعنی مشغلوں سے انھیں کوئی واسطہ نہیں،

اس کا لازمی اثر ان کی عملی زندگی پر یہ پڑتا ہے کہ یہ:-

فمن ذالک القناعۃ بقلیل الدنیا عن کثیرھا والاکتفاء بالقوت الذی لابد منہ والاختصار علی ما لا بد منہ من مہنۃ الدنیا من الملبوس والمفروش والماکول وغیر ذالک واختیار الفقر علی الغنا والاختیار	قناعت کو اپنا شیوہ بنا لیتے ہیں، تقلیل کو کثیر پر ترجیح دیتے ہیں، غذا، لباس اور ہر قسم کے سامان دنیوی سے صرف ما یحتاج کو اختیار کرتے ہیں، بجائے تونگری کے تنگدستی، بجائے سیری کے گرسنگی، بجائے

ومعانقة القلة ومجانبة الكثرة
وایثار الجوع علی الشبع والقلیل
علی الکثیر وترک العلو والترفع
وبذل الجاه والشفقة علی الخلق
والتواضع للصغیر والکبیر (ص۱۱)

افراط کے قلت، بجائے جاہ و
ترفع کے تواضع و انکسار، ہر
چھوٹے بڑے کے مقابلہ میں اپنے
لئے وہ پسند کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ اور کیا ہوتا ہے؟ اور یہ ہوتا ہے کہ۔

حسن الظن بالله والاخلاص
فی المسابقة الی الطاعات
والمسارعة الی جمیع الخیرات
والتوجه الی الله تعالیٰ و
الانقطاع الیه والعکوف علیٰ
بلائه والرضا عن قضائه
والصبر علی دوام المجاهدة
ومخالفة الهوی ومجانبة حظوظ
النفس والمخالفة لها اذ وصفها
الله تعالیٰ امارة بالسوء والنظر
الیها انها اعدیٰ عدوک التی
بین جنبیک کما روی عن رسول الله
صلی الله علیه وسلم (۱۱-۱۲)

اللہ سے حسن ظن رکھتے ہیں۔ تمام
علائق و اسباب سے قطع نظر کر کے
صرف اس پر تکیہ رکھتے ہیں، نیکیوں
اور طاعتوں کی جانب خلوص نیت
کے ساتھ پیش قدمی و تیز روی کرتے
رہتے ہیں۔ بلاء الٰہی پر صابر اور
قضاء الٰہی پر راضی رہتے ہیں، مجاہدہ
اور مخالفت خواہش نفس میں مشغول
رہتے ہیں، اور اس کو یاد رکھتے ہیں کہ
کلام پاک میں نفس کو امارہ بالسوء سے
تعبیر کیا گیا ہے، اور حدیث نبوی میں
ارشاد ہوا ہے کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن
وہ ہے جو اس کے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے

غرض اُن کے تمام اوصاف و اخلاق سنت نبوی و آثار صحابہؓ کی مطابقت میں
ہوتے ہیں، اور گویا سب سے بڑا صوفی وہ ہے جو سب سے زیادہ اہل القرآن اور متبع

سنت ہے، ــــــــ ہمارے زمانہ کے مشائخ، پیرزادوں، گدی نشینوں، صاحبانِ سجادہ کے رئیسانہ و شاہانہ طرزِ معاشرت کو اس صحیح درویشی اور فقیری سے کوئی نسبت ہے؟

منکرین تصوف کا ایک گروہ کہتا ہے کہ قرآن اور احادیث نبوی کے سارے دفتر میں نہ کہیں "تصوف" کا نام آیا ہے نہ کہیں گروہ صوفیہ کا، اس لئے اس مسلک کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا، لیکن حضرت مصنف جس تصوف کے قائل ہیں اس کے تذکرہ سے تو کلام مجید بھرا پڑا ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں ایسے الفاظ و عبارات بکثرت آئے ہیں، جن سے مراد اہل تصوف ہی ہیں، مثلاً صادقین و صادقات، قانتین قانتات، خاشعین، موقنین، مخلصین محسنین، خائفین وجلین، عابدین، ذاکرین صابرین، راسخین، متوکلین، مخبتین، اولیاء مصطفین، ابرار مقربین، سابقین مقتصدین، مسارعین الی الخیرات، مشاھدین (مثلاً اس آیت میں (و القی السمع وھو شھید) اور مطمئنین (مثلاً اس آیت میں الا بذکر اللہ تطمئن القلوب)

اسی طرح دفتر احادیث میں بھی اس طبقہ کی جانب اشارے صراحت کی حد تک مل جاتے ہیں، مثلاً:-

ان من امتی مکلمون ومحدثون وان عمر منھم	میری امت میں ایسے لوگ بھی ہونگے جو مکالمہ (الہی) اور گفتگو سے (الہی) سے سرفراز کئے جائینگے۔ اور عمر بھی انہی میں سے ہیں
یدخل بشفاعتہ رجل من امتی الجنۃ مثل ربیعۃ و مضر یقال لہ اویس قرنی	میری امت میں ایک شخص ایسا بھی ہوگا، جس کی شفاعت سے لوگ جنت میں قبیلہ ربیعہ و مضر کی طرح (یعنی بہت کثرت سے) داخل کئے جائینگے اور ان کا نام اویس قرنی ہوگا۔

معترضین کا ایک گروہ کہتا ہے، کہ عہد رسالت میں کوئی شخص صوفی کے لقب سے نہیں یاد کیا جاتا تھا، یہ اصطلاح بہت بعد کو ایجاد ہوئی ہے، اس لئے اسے کوئی مذہبی وقعت نہیں دی جا سکتی،

مصنف نے اس کا معقول اور دلچسپ جواب دیا ہے کہ

فنقول وبالله التوفيق الصحبة مع رسول الله صلعم لها حرمة وتخصيص من شمله ذالك فلا يجوز ان تعلق عليه اسم على انه اشرف من الصحبة وذالك لشرف رسول الله صلعم وحرمته الا ترى انهم ائمة الزهاد والعباد والمتوكلين والفقراء والراضين الصابرين والمخبتين وغير ذالك وما نالوا جميع ما نالوا الا ببركة الصحبة مع رسول الله صلعم فلما نسبوا الى الصحبة التي هي اجل الاحوال ان يفضلوا بفضيلة غير الصحبة التي هي اجل الاحوال (ص۲۲)

اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی دوسرا تعظیمی لفظ مستعمل ہو ہی نہیں سکتا تھا اس لئے کہ ان کے جتنے بھی فضائل تھے سب سے اشرف و اعظم ان کی فضیلت صحابیت تھی کہ صحبت رسول تمام بزرگیوں اور فضیلتوں سے بڑھ کر ہے، ان کا زہد، تقویٰ، توکل، عبادات، صبر و رضا غرض جو کچھ بھی ان کے فضائل تھے، ان سب پر ان کا شرف صحابیت غالب تھا، پس جب کسی کو لفظ صحابی سے ملقب کر دیا گیا تو اس کے فضائل کی انتہا ہو گئی اور کوئی محل ہی باقی نہیں رہا کہ اسے صوفی یا کسی دوسرے تعظیمی لفظ سے یاد کیا جائے۔

رہا یہ اعتراض کہ یہ اصطلاح بغدادیوں کی رائج کی ہوئی متاخرین کی اختراع ہے، تو مصنف محقق کی تحقیق میں یہ قول بالکل غلط ہے، اس لئے کہ

لان فی وقت الحسن البصری	یہ لفظ حسن بصریؒ کے زمانہ میں رائج
رحمۃ اللہ علیہ کان یعرف	تھا، اور ان کا زمانہ بعض صحابیوں سے
ھذا الاسم وکان الحسن	معاصرت کا تھا،
قد ادرک جماعۃ من اصحاب	
رسول اللہ صلعم	

بلکہ کتاب اخبار مکہ میں جو روایت محمد بن اسحٰق بن یسار وغیرہ سے ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ عہد اسلام سے پیشتر ہی معروف تھا، اور عابد و برگزیدہ اشخاص کے لئے مستعمل تھا، (ص ۲۲)

آج جو مشائخ طریقت قیود شریعت سے آزاد رہنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں، انھیں یہ سن کر مایوسی ہوگی اور شاید حیرت بھی، کہ قدما صوفیہ کے نزدیک طریقت و شریعت میں تخالف مطلق نہ تھا، بلکہ شریعت ہی کی تکمیل و اتمام کا نام طریقت تھا، حضرت مولف فرماتے ہیں، کہ علم کی دو قسمیں ہیں، ظاہری و باطنی، جب تک اس کا تعلق زبان و اعضاء سے ہے اسے علم ظاہری سے تعبیر کریں گے، اور اس کا نام علم شریعت ہے، مثلاً عبادات میں طہارت، نماز روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ یا احکام میں طلاق، فرائض، قصاص وغیرہ جب اُس کا اثر ظاہر سے گذر کر قلب و باطن تک محیط ہو جاتا ہے، تو اسی کو علم باطن یا طریقت سے موسوم کر دیتے ہیں، اور یہاں عبادات و احکام کے بجائے مقامات و احوال کی اصطلاحیں رائج ہیں، مثلاً تصدیق، اخلاص، صبر، تقویٰ، توکل، محبت، شوق وغیرہ، اور اس تفریق دوگانہ کی سند قرآن مجید سے ملتی ہے ارشاد ہوا ہے کہ :۔

وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً	اس نے اپنی نعمتیں تمہارے اوپر پوری
وَّبَاطِنَةً (لقمان، آیت ۲۰)	کیں، ظاہری بھی اور باطنی بھی،

دنیا میں ہر موجود کا ایک پہلو ظاہری ہے، اور ایک باطنی، چنانچہ قرآن کا بھی

ایک ظاہر ہے، ایک باطن، حدیث کا بھی ایک ظاہر ہے، ایک باطن، کتاب اللہ و سنت رسول کے اسی باطنی پہلو کا نام طریقت ہے، طریقت کتاب اللہ اور سنت رسول سے الگ کوئی شے نہیں، بلکہ انہی کے مغز و باطن کا نام ہے، (طلقہ ۲۵)

لفظ تصوف اور صوفی کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ اس کے جواب میں مولف علام نے مختلف قول نقل کر دئے ہیں، ایک قول یہ ہے کہ صوفی دراصل صفوی تھا، یہ لفظ ذرا ثقیل تھا، کثرت استعمال سے زبانوں پر صوفی رہ گیا۔

ابوالحسن قنادؒ کا خیال تھا کہ صوفی صفا سے مشتق ہے، اور اس کا اطلاق اہل صفا پر ہوتا ہے، ایک اور بزرگ کا مقولہ ہے کہ جو لوگ کدورت بشریت سے پاک وصاف کر دیے گئے وہ صوفی کہلانے لگے ایک اور بزرگ کی رائے میں ان لوگوں کا لباس انبیاء علیہم السلام کی تقلید میں صوف (پشمینہ) کا ہوتا تھا، اس لئے یہ صوفی کہلائے ایک اور گروہ اس طرف گیا ہے کہ اصحاب صفہ کے باقیات صالحات صوفی کے لقب سے موسوم ہوئے، وقس علی ھذا؟

حضرت جنیدؒ فرماتے تھے کہ ہمارا یہ سارا علم احادیث نبوی کا نچوڑ ہے، قرآن میں اتباع سنت نبوی کا حکم صاف الفاظ میں آیا ہے، (وان تطیعوہ تھتدوا) (نور آیت ۵۴) ابوعثمانؒ سعید الخیری کا مقولہ تھا کہ جو شخص سنت نبوی کو قولاً و فعلاً اپنے اوپر حاکم بنالے، اس کی بات ہمیشہ حکمت سے لبریز نکلے گی، حضرت بایزید بسطامیؒ نے اللہ سے دعا کرنی چاہی کہ گرسنگی اور شہوت کی آفت سے ہمیشہ محفوظ رہیں، کہ معاً انھیں یہ خیال آ گیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے ایسی دعا نہیں کی تو میں کیونکر کر سکتا ہوں، یہ خیال کر کے وہ اس دعا سے باز رہے، اس احترام رتبہ رسالت کا صلہ انھیں یہ ملا کہ عورت کی خواہش ہی اُن کے دل سے جاتی رہی، ذوالنون مصریؒ کا قول تھا کہ اللہ کو تو میں نے اللہ کے ذریعہ سے پہچانا، باقی اور سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ذریعہ سے، سہل بن عبداللہ تستریؒ فرماتے تھے کہ جس وجد کی شہادت کتاب اللہ و سنت رسول نہ دیں وہ باطل ہے اور اسی کے قریب قریب قول ابو عثمان دارانی کا ہے، حضرت شبلیؒ مرض الموت میں مبتلا تھے، نزع کا وقت تھا، گویائی کی قوت جواب دے چکی تھی، ایک خادم وضو کرا رہا تھا، داڑھی میں خلال کرانا بھول گیا، شبلیؒ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر داڑھی میں خلال کرائی کہ سنت رسول کا کوئی خفیف جزو بھی فروگذاشت نہ ہونے پائے ـــــ صوفیہ متقدمین کے یہ سارے اقوال و اعمال ایک مستقل باب میں جمع ہیں (صفحہ ۱۰۳-۱۰۴)

مسائل تصوف، مسائل فقہ کی طرح تمامتر کتاب اللہ و سنت رسولؐ ہی سے مستنبط و ماخوذ ہوتے ہیں، اس استنباط کا طریقہ اور اس کی کیفیت جو مصنف علام نے بیان کی ہے، وہ اس قابل ہے کہ اُسے بجنسہٖ نقل کر دیا جائے، ترجمہ لفظاً نہیں صرف خلاصتہً درج کیا جائے گا:۔

المستبنطات ما استنبط اهل الفهم	استنباط کا حق ان محققین وارباب
من المحققين بالموافقة لكتاب	فہم کو پہنچتا ہے جو ظاہر و باطن ہر
الله عزوجل ظاهراً و باطناً	طرح کتاب اللہ و سنت رسول
والمتابعة لرسول الله صلعم	کے متبع ہوتے ہیں، یہ لوگ جب
ظاهراً و باطناً والعمل بهما	عرصہ تک اپنے علم و معلومات
بظواهرهم و بواطنهم فلما	کے مطابق عمل کرتے رہتے ہیں،
اعملوا بما علموا من ذلك	تو اللہ انھیں وہ علم بھی دیدیتا ہے
ورثهم الله تعالى علم ما لم	جو پیشتر انھیں نہ تھا، اور یہ علم انہی
يعلموا وهو علم الاشارة	کے ساتھ مخصوص رہتا ہے، وہ
وعلم مواريث الاعمال	ان کے نفوس میں تزکیہ اور قلوب

التی یکشف اللہ تعالی قلوب
اصفیایہ من المعانی المذخورۃ
واللطائف والاسرار المخزونۃ
وغرائب العلوم وطرائف الحکم
فی معانی القرآن ومعانی اخبار
رسول اللہ صلعم من حیث احوالھم
واوقاتھم وصفاء اذکارھم
قال اللہ تعالیٰ "افلا یتدبرون
القرآن ام علی قلوب اقفالھا"
وقال النبی صلعم من عمل بما علم و
ورثہ اللہ تعالیٰ اعلم ما لم یعلم
وھو العلم الذی لیس لغیرھم
ذالک من اھل العلم واقفال
القلوب ما یقع علی القلوب
من الصدا لکثرۃ الذنوب و
اتباع الھوی ومحبۃ الدنیا
وطول الغفلۃ وشدۃ الحرص
وحب الراحۃ وحب الثناء
والمحمدۃ وغیر ذالک من الغفلات
والزلات والمخالفۃ والخیانات
واذا کشف اللہ تعالیٰ ذالک

میں جلا پیدا کرتا ہے، اور کثرت
معاصی و شہوات، حب جاہ، حرص
طمع، خود پسندی وغیرہ سے جو زنگ
الواح قلب پر جا ہوتا ہے، وہ
دھل جاتا ہے اس وقت ان پر
اسرار غیب منکشف ہو جاتے
ہیں، اور ان کی زبانیں حقائق
عالیہ کی ترجمانی کرنے لگتی ہیں،

عن القلوب بصدق التوبۃ
والندم علی الحوبۃ فقد فتح
الاقفال من القلوب واتته
الزوائد والفوائد من الغیوب
فیعبر عن زوائدہ وفوائدہ
بترجمانہ وھو اللسان الذی
ینطق بغرائب الحکم وغرائب العلم
فاذا شرحوا ھذہ النقط المریدون
والقاصدون والطالبون من
تلک الجواھر باذان واعیۃ و
قلوب حاضرۃ فماشوا وانتفعوا
بذالک وانعشوا (صفحہ ۱۰۵-۱۰۶)

اس کے بعد مصنف علام قرآن مجید کی اس آیت واذا جاءھم امر من الامن او الخوف اذاعوا بہ ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم سے یہ لطیف استدلال کرتے ہیں کہ اولی الامر یا اہل علم وہ ہیں جو حقائق دین کے جاننے والے ہیں، اور ان کے طبقہ میں بھی جنھیں امتیازی خصوصیت حاصل ہے وہ اہل استنباط ہیں۔

اسوۂ رسولؐ کے بعد حضرات صوفیہ کے نزدیک سب سے زیادہ مہتم بالشان اسوۂ صحابہ ہے، اللمع کی کتاب الصحابہ ان کے اسی اعتقاد کی تفسیر ہے، صحابہؓ کی عام مدح و تکریم کے بعد اس باب کی پہلی فصل کا آغاز حضرت صدیقؓ کی ذات سے ہوتا ہے، جو اعظم الخوف و اعظم الرجاۃ تھے، یعنی اللہ سے ڈرتے بھی بیحد تھے، اور

اس کی رحمت کے اُمیدوار بھی بیحد رہتے تھے، چنانچہ فرماتے تھے کہ:۔

لو نادیٰ مناد من السماء انہ	اگر آسمان سے یہ ندا آئے کہ جنت میں
لن یلج الجنۃ الا رجل واحد	بجز ایک شخص کے اور کوئی داخل نہ
ارجوان اکون انا ھو و لو	ہوگا تو مجھے تو یہ امید پڑ جائے گی،
نادیٰ مناد من السماء انہ	کہ وہ میں ہی ہوں گا اور اگر آسمان
لا ید خل النار الا رجل	سے یہ ندا آئے کہ بجز ایک کے کوئی
واحد لخفت ان اکون	دوزخ میں نہ ڈالا جائے گا تو میں
انا ھو (صفحہ ۱۲۱)	اپنے ہی لئے ڈروں گا،

ابو العباس بن عطاؒ سے جب آیہ کریمہ کُونُوا رَبَّانِیِّیْنَ کے معنی دریافت کئے گئے تو انھوں نے کہا کہ ابو بکرؓ کے مانند ہو جاؤ، حضرت صدیقؓ ہی وہ شخص تھے جنھوں نے سارا مال و اسباب لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر کر دیا اور جب آپؐ نے دریافت فرمایا کہ اہل و عیال کے لئے کیا چھوڑا؟ تو برجستہ جواب دیا کہ اللہ اور رسول کو۔ سراج کہتے ہیں کہ یہ فقرہ توحید کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، اور سب سے پہلا صوفیانہ ارشاد تھا، جو انسانی زبان سے ادا ہوا،

حضرت صدیقؓ کی سب سے بڑی خصوصیات الہام و فراست تھیں اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کی نمایاں خصوصیات ترک شہوات، اجتناب شبہات اور تمسک بالحق تھیں، حضرت عثمانؓ کی اہم خصوصیات تمکین، ثبات و استقامت تھیں، حضرت علیؓ اکثر سلاسل تصوف کے شیخ الشیوخ ہیں۔ آپ علم لدنی کے سب سے بڑے حصہ دار تھے، یہ وہی علم لدنی ہے جو حضرت خضر کو عطا ہوا تھا، وعلمناہ من لدنا علما اور اسی بنا پر آپ نے حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر سے کہدیا تھا کہ آپ صبر کے ساتھ میری رفاقت نہ کر سکیں گے، اِنَّکَ لَن تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا اور یہیں سے بعض لوگوں

نے غلطی سے ولایت کو نبوت سے افضل قرار دے لیا ہے، حضرت علیؓ مراتب توحید، معرفت، ایمان، علم میں کامل ترین تھے —— اور ان چاروں اصحاب رسولؐ کے آثار قدیم صوفیہ کے لئے دلیل راہ ہیں،

خلفائے اربعہ کے بعد ذکر قدرۃً اصحاب صفہ کا آتا ہے، ان کی زندگی کا ایک ایک جزء طالبان طریقت کے لئے درس ہدایت ہے، یہ مقدس گروہ، معاشِ دنیوی کی راہوں سے بیگانہ، بس شمع نبوت کے گرد پروانہ وار نثار رہتا تھا، ان کے ہاں نہ کھانے کا سامان رہتا تھا نہ اوڑھنے پہننے کا، اور ان کی زندگی فقر و فاقہ کے ساتھ تمامتر توکل و صبر اور عشق و محبت کا ایک تسلسل تھی، اس جماعت کی مدح خود متعدد آیات قرآنی میں آئی ہے، مثلاً

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ (بقر۔ آیت ۲۷۳)

ولا تطرد الذین یدعون ربھم (انعام۔ آیت ۵۲)

اس حصہ کی آخری فصل میں عام صحابہؓ کی زندگی پر تصوفانہ حیثیت سے نظر کی گئی ہے اور ان کے اقوال و آثار کو صوفیہ کے لئے شمع ہدایت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اصحاب ذیل کے اسمائے مبارک اس حیثیت سے خاص طور پر قابل توجہ ہیں :—

طلحہ بن عبید اللہؓ، معاذؓ بن جبل، عمرانؓ بن حصین، سلمانؓ فارسی، ابو الدرداءؓ، ابو ذر غفاریؓ، ابو عبیدہؓ بن الجراح، عبد اللہؓ بن مسعود، براءؓ بن مالک، عبد اللہؓ بن عباس، کعبؓ احبار، حارثہؓ، ابو ہریرہؓ، انسؓ بن مالک، عبد اللہؓ بن عمر، حذیفہؓ بن الیمان، عبد اللہؓ بن جحش، اسامہؓ، بلالؓ، مصعبؓ بن عمیر، عبد الرحمن بن عوفؓ، حاکم بن حزامؓ، عبد اللہ بن رواحہ، عدیؓ بن حاتم رضی اللہ عنہم اجمعین،

حضرت سراج اکابر صوفیہ کے آداب و معمولات بیان کرنے کے بعد زور

ضرورت مرشد پر دیتے ہیں، اور اس ضمن میں گہرے گہرے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں۔
مبتدیوں کے ایک گروہ کا خیال یہ ہوتا ہے کہ حصول مقصد کے لئے بہترین ذریعہ مخالفت نفس کا ہے، چنانچہ اپنی تجویز سے طرح طرح کے مجاہدے اپنے لئے اختیار کر لیتے ہیں، کبھی غذا بہت گھٹا دیتے ہیں، لذیذ غذائیں بالکل ترک کر دیتے ہیں، وقس علیٰ ہذا حضرت سراجؒ فرماتے ہیں کہ جب تک مرشد یا شیخ اس قسم کے احکام نہ دے، انھیں اپنی رائے سے اختیار کر لینا قطعاً غیر مفید رہے گا بلکہ اندیشہ مضرت کا ہے، مثلاً ترک غذا کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان فرائض یومیہ، نماز پنجگانہ وغیرہ پوری طرح نہ ادا کر سکے گا، نفس امارہ کو زیر کر لینا اتنا آسان نہیں کہ بغیر استاد کامل کی توجہ کے، انسان تن تنہا یہ ہفتخوان طے کر لے جائے، خود رائی اس راہ میں خطرہ و ہلاکت کی طرف لیجانے والی ہے، (صفحہ ۴۱۴-۴۱۸) سارے اعمال و مجاہدات کے لئے مخصوص آداب و شرائط ہیں، بغیر اُن کے قدم اٹھانا سخت نادانی ہے،

متوسطین و متاخرین صوفیہ کے گروہ میں سماع کی بحث ایک بڑی اہمیت رکھتی ہے، طریقت کے اِس استاد قدیم نے بھی اس پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے سب سے پہلے حسن صوت کو لیا ہے، اور اُس کی مدح و توصیف میں متعدد احادیث نبوی نقل کی ہیں، مثلاً زینوا القرآن باصواتکم یا ما بعث اللّٰہ نبیاً الا حسن الصوت یا لقد اعطی ابوموسیٰ مزماراً من مزامیر آل داود لما اعطی من حسن الصوت،

اس کے بعد سماع کے مختلف معانی، سماع شعر وغیرہ کا ذکر کیا ہے، اور متقدمین میں جو حضرات جواز سماع کے قائل گزرے ہیں، ان کے اقوال نقل کیے ہیں، آگے چل کر ایک باب اباحت سماع عامہ کے عنوان سے قائم کیا ہے، اُس میں عید کے دن بیت عائشہؓ میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے گانا سننے کا حوالہ دیا ہے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت بلالؓ اور دوسرے صحابیوں کے اشعار پڑھنے کا ذکر

کیا ہے، اور مالک بن انس، عبد اللہ بن عمرؓ، عبد اللہ بن جعفرؓ اور امام شافعیؒ سے شعر کو ترنم کے ساتھ پڑھنے کا جو جواز منقول ہے، ان سب کی سند جواز سے فائدہ اٹھایا ہے، لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ ان ساری بحثوں کو پیشہ ور قوالوں اور گویوں کے گانے کی محفلوں سے جن میں لوگ بھی ہر قسم کے شریک رہتے ہیں، اور مضمون بھی ہر قسم کے گائے جاتے ہیں، اصلاً کوئی تعلق نہیں،

سماع خاصہ کے ضمن میں سامعین کے تین طبقے کئے ہیں، مبتدیین، مریدین متوسطین وصد یقین، عارفین واہل استقامۃ اور زمان، مکان واخوان کی قید یاد دلائی ہے، غرض یہ کہ مختلف ابواب میں مسئلہ سماع کے مختلف پہلوؤں کو لیا ہے، اور ہر باب میں ہر پہلو پر تفصیلی نظر کی ہے، اور جواز کے جو آداب اور جو شرائط وقیود ہیں ان سے کسی حال میں اغماض نہیں برتا ہے، آخر باب میں اس گروہ کے خیالات کی ترجمانی کی ہے، جو جواز سماع کا منکر یا اس کی کراہت کا قائل ہے ان چند ابواب کا مطالعہ مشایخ وقت کے لئے خاص طور پر سبق آموز ہوگا۔

اقتباسات وتلخیصات سے نوعیت کتاب کا کافی اندازہ ہو گیا ہوگا اور آج کی اعجوبہ پرستیوں سے اس کا مقابلہ کرنے سے صاف نظر آگیا ہوگا کہ یہ جو مجموعۂ بدعات ومنہیات، تصوف کے نام سے درگاہوں اور مزارات پر چل رہا ہے اس میں اور قدیم ترین اسلامی سلوک وطریقت میں فرق عظیم الشان ہے۔

(۲) کشف المحجوب

شیخ علی بن عثمان ہجویری رح

(الف) مصنف[1]

پورا اسم گرامی علی بن عثمان بن علی الغزنوی الجلابی اللاہوری ہے، شہرت عام عرفت داتا گنج بخش سے ہے۔

وطن غزنی (افغانستان) تھا، ہجویر و جلاب دو قریے مضافات غزنی میں، قیام دونوں میں رہا آخر عمر میں ہندوستان آکر لاہور میں سکونت اختیار فرمائی تھی، یہیں انتقال کیا، یہیں دفن ہوئے اس ساری نقل و حرکت کے اظہار کے لئے نام کے ساتھ "غزنوی جلابی ہجویری لاہوری" کا ضمیمہ لگا ہوا ہے،

سید حسنی تھے، شجرۂ نسب تذکروں میں یوں دیا ہے، علی بن سید عثمان بن سید علی بن شاہ شجاع بن ابو الحسن علی بن حسن اصغر بن سید زید چیشیہ بن سیدنا حضرت حسن رض بن سیدنا حضرت علی مرتضیٰ رض۔

---

[1] ماخذ (۱) نفحات الانس (جامی) (۲) سفینۃ الاولیاء (داراشکوہ) (۳) خزینۃ الاصفیا ۲ جلد۔ (غلام سرور لاہوری، نولکشور پریس لکھنؤ) (۴) مآثر الکرام (غلام علی آزاد بلگرامی مطبوعہ حیدرآباد) (۵) فوائد الفواد (از امیر حسن علاء سنجری، نولکشور پریس لکھنؤ)

بیعت شیخ ابو الفضل بن حسن ختلی سے تھی اور وہ شیخ ابو الحسن خصری کے مرید تھے، شجرہ طریقت سید الطائفہ جنید بغدادیؒ تک پہونچتا ہے۔ جن دوسرے بزرگوں سے استفادہ کیا تھا، جابجا ان کا ذکر اپنے قلم سے کرتے گئے ہیں، اور اپنے اُن کے تعلقات پر روشنی بھی ڈالتے گئے ہیں، مثلاً شیخ ابو العباس احمد اشقانی کے ذکر میں ہے :۔

مرا بدے اُنسے عظیم بود و وے را
بر من شفقت صادق اندر بعضے علم
استاد من بود (کشف المحجوب صـ۲۱)

مجھے ان سے بڑی محبت تھی اور وہ
بھی میرے اوپر دل سے شفقت رکھتے تھے
اور بعض علوم میں میرے استاد تھے۔

ایک جگہ خواجہ ابو احمد مظفرؒ سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے، اور ایک صوفیانہ مسئلہ کا بھی انکشاف کرتے گئے ہیں :۔

روزے من اندر گرمائے گرم بنزدیک
وے اندر آمدم با جامہ راہ ژولیدہ
موئے، مرا گفت یا ابا الحسن ارادت
دالی مرا بگوئی تا چیست، گفتم مرا سماع
می باید، اندر حال کس فرستاد تا قوالے
بیارد و رندو جماعتے را از اہل عشرت
و آتش کودکی و قوت ارادت و حرکت
ابتداء مرا اندر سماع کلمات مضطرب
کرد چون زمانے بر آمد و سلطان و غلیان
آں وقت اندر من کمتر شدہ مرا گفت
چگونہ بودم اتدایہ ایں سماع، گفتم
ایہا الشیخ سخت خوش بودم، گفت وقتے

میں ایکدن ان کے پاس سخت گرمی
کے موسم میں آیا مسافرانہ کپڑے پہنے
ہوئے اور الجھے ہوئے بالوں کیساتھ مجھ سے
پوچھا اسوقت کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا
سماع سنوائیے۔ انھوں نے فوراً کسی کو بھیجکر
ایک قوال اور چند گویوں کو بلالیا۔ کم
عمری کے جوش و شوق میں میں سماع سے
بہت ہی متاثر ہوا، کچھ دیر بعد جب
میرا جوش و خروش ختم ہو تو انھوں نے
کہا کہ سماع کا مزا کیسا رہا، میں نے
جواب دیا کہ اے شیخ میرے لئے تو بہت
ہی اچھا تھا، فرمایا ایک وقت ایسا آئیگا کہ

بیابد کہ ایں وبانگ کلاغ ہر دو م
ترا یکساں شود، قوت سماع تا
آنگاہ بود کہ مشاہدہ نہ باشد چوں
مشاہدہ حاصل آید، ولایت سمع
ناچیز شود مگر تا ایں را عادت نہ
کنی تا طبیعت نہ شود، (صفحہ ۱۲۳)

یہ سماع اور کوے کی آواز تمھارے
لئے یکساں ہو جائے گی، سماع میں جان
اسوقت تک ہے جبتک مشاہدہ پیدا نہیں
ہوتا، جب مشاہدہ حاصل ہوجائیگا، شوق
سماع جاتا رہے گا، لحاظ رکھو کہ کہیں یہ عادت
پڑکر جزو طبیعت نہ بن جائے۔

اسی طرح بعض دوسرے مشاہیر معاصرین سلطان ابو سعید ابو الخیرؒ شیخ ابو القاسم قشیریؒ، شیخ ابو القاسم گرگانیؒ وغیرہم سے ملاقاتوں کے دلچسپ تذکرے لکھے ہیں، اپنے شیخ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں :۔

زیں اوتاد شیخ عباد ابو الفضل محمد
ابن الحسن الختلیؒ، اقتدائے من اندر
طریقت بدوست، عالم بود بہ علم
تفسیر و روایات، و اندر تصوف
مذہب جنید داشت و مرید حصری
بود و صاحب یزدانی و اقران
ابو عمر قزوینی و ابو الحسن بن سالبہ
و شصت سال بحکم عزلتے صادق
بگوشہا اندر میگریخت و نام خود
از میان خلق گم کردہ بود و بیشتر
بجبل لگام بودے، عمرے نکو یافت
وے را آیات و براہین بسیار بود

ابو الفضل محمد حسن ختلیؒ بزرگوں اور
عابدوں کے سرتاج تھے، میں طریقت
میں انہی کا مرید ہوں، علم تفسیر و روایات
کے عالم تھے، اور تصوف میں جنیدؒ کے
ہم مذہب، حصری کے مرید تھے، اور
یزدانی کے دوست اور ابو عمر قزوینی
اور ابو الحسن بن سالبہ کے معاصر تھے،
ساٹھ سال تک اپنے کو شہرت خلق سے
دور گوشہ نشینی اور گمنامی میں رکھا، قیام
زیادہ تر کوہ لگام پر رہا، عمر بھی پائی
(ولایت کے) بہت سے ثبوت و شواہد
رکھتے تھے، لیکن لباس اور آثار ظاہری

اما لباس از رسوم متصوفہ نداشتی
زباابل رسم شدید بودے ومن
از وے ہرگز مہیب تر مردے
نہ دیدہ بودم (صفحہ ۱۲۰)

صوفیہ کے سے نہ رکھے۔ جو لوگ رسوم
صوفیہ کے پابند تھے، ان سے درشتی
برتتے، میں نے ان سے زیادہ پر رعب
کسی کو نہیں دیکھا۔

حنفی المذہب تھے، امام ابو حنیفہ سے خاص عقیدت تھی، ان کا نام امام ائمہ و مقتدائے سنیاں شرف فقہاء وعز علماء" کی حیثیت سے لیا ہے، اور ان کے کمالات کا بیان تفصیل سے کیا ہے، (صفحہ ۶۶ تا صفحہ ۶۹) اس ضمن میں اپنا ایک دلچسپ خواب بھی تحریر کیا ہے، فرماتے ہیں:-

"میں ملک شام میں تھا، کہ ایک مرتبہ حضرت بلال رضؓ موذن رسولؐ کے مزار کے سرہانے سو گیا، خواب میں دیکھتا ہوں کہ مکہ معظمہ میں حاضر ہوں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باب بنی شیبہ سے اندر داخل ہو رہے ہیں، اور جس طرح کوئی کسی بچہ کو گود میں لئے ہو، آپ ایک مسن شخص کو گود میں لئے ہوئے ہیں، میں دوڑتا ہوا حضور میں پہونچا، پائے اقدس کو بوسہ دیا، اور دل میں سوچنے لگا، کہ یہ مسن شخص کون ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے خطرۂ قلب پر اطلاع ہو گئی، ارشاد ہوا کہ یہ شخص تیرا اور تیری قوم کا امام ہے، یعنی ابو حنیفہؒ اس خواب سے مجھے اپنے اور اپنی قوم کے حق میں بڑی امیدیں قائم ہو گئیں، اور مجھے اس خواب سے یہ بھی منکشف ہو گیا کہ امام ابو حنیفہؒ ان لوگوں میں سے ہیں، جو اپنے صفات ذاتی سے فانی ہو چکے ہیں، اور محض احکام شرع کے لئے باقی رہ گئے ہیں، اس لئے کہ ان کے حامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، اگر میں انھیں چلتے دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ وہ باقی الصفات ہیں، اور باقی الصفات کے لئے خطا و صواب دونوں کا امکان ہے لیکن چونکہ انھیں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں دیکھا، اس سے معلوم ہوا کہ ان کا وجود ذاتی فنا ہو چکا

ہے، اور اب جو ان کا وجود قائم ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے قائم ہے، اور چونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کسی طرح کی خطا کا امکان نہیں، اس لئے جس کا وجود ان میں فانی ہو چکا ہے وہ بھی امکان خطا سے پاک ہے"۔ (صفحہ ۶۸-۶۹)

سفر و سیاحت میں اکثر رہا کرتے تھے، شام سے لے کر ترکستان تک اور ساحل سندھ سے لے کر بحر قزوین تک یعنی اپنے زمانہ کی تقریباً ساری اسلامی عملداری کی سیاحی کا ذکر کیا ہے۔ آذربیجان، بسطام، دمشق، رملہ، بیت الجن، طوس، مہنہ اور جبل السلام کے نام اپنے سفر ناموں کے ذیل میں تصریح کیساتھ لئے ہیں، ایک مرتبہ عراق کے دوران قیام میں معلوم ہوتا ہے کہ معاش وافر تھی، اور اسی کے ساتھ مصارف کی زیادتی سے نوبت قرضداری کی آگئی تھی، اور یہ اس فکر میں گھلے جاتے تھے کہ ہر شخص کی حاجت روائی کہاں تک کریں، آخر ایک درویش کی موعظت سے، پریشان خاطری سے رہائی نصیب ہوئی فرماتے ہیں "۔

وقتے من اندر دیار عراق اندر طلب دنیا و فنا کردن آں تاپاکی کی کردم و دام بسیار بر آمدہ بود و ہر کسے راکہ بایستے روے بروے من آوردہ بود و من در رنج حصول ہوائے شاں ماندہ بودم، سیدے از سادات وقت بمن نوشت کہ اے پسر نگر تا دل خود را از خدا مشغول نہ کنی

ایک بار میں حدود عراق میں دنیا کے حاصل کرنے اور اس کے لٹا دینے میں بے طرح مشغول تھا، اور بہت قرضدار ہو گیا تھا جس کو جس چیز کی بھی خواہش ہوتی، بس میری ہی طرف رخ کرتا، اور میں اس فکر میں رہتا تھا کہ کیسے سب کی خواہش پوری کر دوں، کہ شیوخ وقت میں سے ایک شیخ نے مجھے لکھا کہ اے

بر فراغت دلے کہ مشغول ہواست
پس اگر دلے یابی عزیز تر از دل خود
روا باشد کہ بفراغت آں دل دل
خود را مشغول گردانی والا کہ دست
ازآں کار بدار کہ بندگان خدا را
خداوند باشد اندر وقت را
بدیں سخن فراغتے پدید آمد (ص ۲۶۵)

فرزند کہیں، اپنے دل کو مشغولیٔ خدا سے
ہٹا کر اس کی طرف مشغول نہ کر لینا جو مشغول ہوائے
نفس ہے، ہاں اگر کوئی ایسا شخص ملے جس کا
دل تم سے بڑھ کر موجب تو اس کی تشفی خاطر کرو
ورنہ سب کے لئے اپنا دل حیران و پریشان
نہ رکھو اللہ خود ہی اپنے بندوں کے لئے کافی
ہے، بس اس وقت سے میرے دل کو قرار آ گیا

قید از دواج سے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہمیشہ آزادی رہی، البتہ ایک مقام پر آپ بیتی یوں بیان کرتے ہیں کہ جیسے غائبانہ کسی سے تعلقات محبت قائم ہو گئے تھے، اور یہ ایک سال تک اس زخم لطیف کے بسمل بنے رہے، پھر آخر اس سے نجات مل گئی، بیان ہے اتنا مجمل کہ تفصیلات کا کچھ پتہ نہیں چلتا، لکھا ہے کہ

من کہ علی بن عثمان الجلابی ام از
پس آنکہ مرا حق تعالیٰ یازدہ سال
از آفت تزویج نگاہ داشتہ بود ہم
تقدیر کرد تا بفتنہ اندر افتادم ظاہر
باطنم اسیر صفتے باشد کہ با من کردند
بے آنکہ رویت بودہ بود و یک سال مستغرق
آں بودم چنانچہ نزدیک بود کہ دین
بر من تباہ شود تا حق تعالیٰ بہ کمال
لطف و تمام فضل خود عصمت را
باستقبال دل بیچارۂ من فرستاد

مجھ علی بن عثمان جلابی کو اللہ نے
گیارہ سال تک تزویج کی مصیبت
سے محفوظ رکھا، اس کے بعد تقدیر
الٰہی یہ ہوئی کہ میں آزمائش میں
پڑوں، چنانچہ بغیر شکل دیکھے، محض
دوسروں سے اوصاف سُن کر میرا
ظاہر و باطن اسی کی طرف گرفتار
رہا، یہاں تک قریب تھا کہ میرا دین
تباہ ہو جائے کہ حق تعالیٰ نے
کمال لطف و کرم سے میری

بہ رحمت خلاصی ارزانی داشت (صفحہ ۲۸۵) دستگیری کی۔

استعداد علمی کی تفصیل کسی تذکرہ میں نظر سے نہیں گذری، لیکن کشف المحجوب خود اس امر کا ایک واضح ثبوت ہے کہ اُس کا مصنف علم باطن کے علاوہ علوم ظاہری پر بھی وسیع نظر رکھتا ہے، بعض تذکروں میں اجمالاً صرف اتنا ہے کہ جامع بود میان علوم ظاہر و باطن،، اور اتنا تو یقیناً صحیح معلوم ہوتا ہے۔

بعض تذکروں میں ہے کہ لاہور اپنے پیر و مرشد کے حکم سے آئے تھے، اور حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء دہلویؒ کے ایک ملفوظ میں تو ورود لاہور کی تفصیل بھی ملتی ہے، فوائد الفواد میں ہے کہ علی ہجویری اور شیخ حسین زنجانی دونوں ایک ہی مرشد سے بیعت رکھتے تھے، شیخ حسن زنجانی عرصہ سے لاہور میں سکونت رکھتے تھے، ایک روز شیخ علی ہجویریؒ کو مرشد کا حکم ملا کہ لاہور میں سکونت اختیار کرو عرض کیا کہ وہاں تو شیخ حسین پیشتر سے موجود ہیں، مکرر ارشاد ہوا کہ تم جاؤ تعمیل کی شب میں لاہور پہونچے، اسی شب میں شیخ حسین نے انتقال کیا (صـ ۳۵)

ان روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کو مرشد کے حکم سے اپنا مسکن بنایا تھا، لیکن کشف المحجوب سے کچھ ایسا پایا جاتا ہے کہ لاہور کا قیام مرضی کے خلاف کسی مجبوری سے تھا، فرماتے ہیں:۔

کتب من بہ حضرت غزنین ماندہ بود	میری کتابیں غزنی میں چھوٹ گئی تھیں
و من اندر دیار ہند در بلدۂ لاہور	اور میں حدود ہند میں شہر لاہور میں کہ
کہ از مضافات ملتان است درمیان	مضافات ملتان میں سے ہے، ناجنسوں
ناجنساں گرفتار شدہ بودم (صـ ۶۵)	کے درمیان گرفتار تھا۔

عام لقب جو گنج بخش چلا ہوا ہے، اس کی بابت روایت یہ ہے کہ خواجہ معین الدین حسن سنجری اجمیریؒ نے آپکے مزار پر آکر حسب دستور صوفیہ چلہ کشی کی اور فیض و برکت سے

مالامال ہو کر جب رخصت ہونے لگے تو مزار کے رخ کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا ؎

گنج بخش ہر دو عالم مظہر نور خدا ۔۔۔ کاملاں را پیر کامل ناقصاں را رہنما

سال وفات سے متعلق اختلاف ہے، مزار پر جو قطعہ تاریخ کندہ ہے، اس میں ۴۶۵ھ درج ہے، دوسرے قرینے بھی اسی کی تائید میں ہیں، مزار لاہور میں سمت غرب میں واقع ہے، اب تو آبادی وہاں تک ہو گئی ہے، پہلے شہر پناہ سے باہر تھا، اہل حاجت یوں بھی برابر آتے جاتے رہتے ہیں، جمعرات اور جمعہ کو بھیڑ زائد ہو جاتا ہے، عقیدتمندوں کا خیال ہے کہ اگر چالیس روز متصل حاضری دی جائے یا چالیس جمعہ کی راتوں کو مزار کا طواف کیا جائے[1] تو ہر مشکل آسان اور ہر حاجت روا ہو جاتی ہے، زیارت ایک بار ۱۹۴۲ء ۱۳۶۱ھ میں ان سطور کے راقم آثم نے بھی کی ہے خلاف شریعت بدعتوں کا مرکز جس طرح ہر بڑی درگاہ ہے یہ مزار بھی ہے،

تصوف و طریقت پر کتابیں متعدد لکھیں، لیکن آج وہ ناپید ہیں، بلکہ تذکروں میں تو ان کے نام تک درج نہیں، سفینۃ الاولیاء وغیرہ میں اجمالی ذکر صرف اس قدر آتا ہے کہ "حضرت پیر علی ہجویری را تصانیف بسیار است"، نکلسن نے خود کشف المحجوب کے اندر ڈوب کر ذیل کی کتابوں کا پتہ تو لگا ہی لیا ہے،

۱۔ دیوان۔ "یکے آنکہ دیوان شعرم کسے بر خاست"۔ (کشف، ص۱)

۲۔ منہاج الدین۔ "دیگر کتابے تالیف کردم اندر طریق تصوف، نام آں منہاج الدین" پیش ازیں کتابے ساختہ ام، مرآں را منہاج الدین نام کردہ اند، اندر دے مناقب اہل صفہ یک یک بہ تفصیل آوردہ"۔ (ص۸۰) نیز اندر کتابے کہ کردہ ام بجز ایں منہاج نام"۔ (ص۱۱۱)

۳۔ کتاب الفناء والبقاء۔ مارا ازیں جنس سخن است اندر کتابے فنا و بقا (ص۱۴)

۴۔ اسرار الخرق والمؤونات، "مرا اندریں باب کتابے کہ نام آں اسرار الخرق

---

[1] حالانکہ طواف روئے زمین کی کسی عمارت کا بھی بجز کعبۃ اللہ کے شریعت سے ثابت نہیں

دالمود نانست و نسخہ آں مرید را باید" (صہ ۲۸)

۵. کتاب البیان لاہل العیان "من اندریں معنی تا حال ہدایت کتابے ساختہ ام و آں را کتاب البیان لاہل البیان نام کردہ شد۔" (صہ ۱۹۵)

۶. بحر القلوب۔ " اندر بحر القلوب اندر باب جمع فصولے مشتبہ گفتہ ام" (صہ ۱۹۵)

۷. الرعایۃ لحقوق اللہ "طالب ایں علم را ایں مسئلہ از کتاب دیگر باید طلبید کہ کردہ ام، آں را الرعایۃ لحقوق اللہ نام کردہ۔" (صہ ۲۱۱)

کشف کی دو عبارتوں میں کتابوں کے حوالے اور بھی ہیں، اب خدا معلوم ان سے مراد انہی مذکورہ بالا کتابوں میں سے کوئی دو ہیں یا یہ دو ان کے علاوہ ہیں،

"پیش ازیں اندر شرح کلام وے (منصور حلاج) کتابے ساختہ ام" (صہ ۱۱۱)

"من اندر بیان ایں (ایمان) کتابے کردہ جداگانہ، (صہ ۲۱۵)

اگر یہ دو کتابیں ان کے علاوہ ہیں، (جیسا کہ نکلسن کا خیال ہے) تو مجموعی تعداد نو کتابوں کی ہوتی ہے، اور ایک خود یہی کشف المحجوب، کل دس ہوئیں اور چونکہ یہ بھی نہیں معلوم کہ کشف کی تصنیف کب ہوئی، اور شیخ اُس کے بعد کب تک زندہ رہے، اسلئے ہو سکتا ہے کہ ان دس پر بعد میں کچھ اور بھی اضافہ ہوا ہو،

مخدوم کے مرتبۂ کمال کا اعتراف سب کو رہا ہے، خواجۂ خواجگان معین الدین چشتی اجمیریؒ اور شیخ المشائخ فرید الدین گنج شکرؒ دونوں سے متعلق روایت ہے کہ آپ کے مزار پر جا کر چلے کھینچے ہیں اور فیوض و برکات حاصل کئے ہیں، چنانچہ دونوں حضرات کے مکانات میں چلہ کشی کے نقوش اب تک محفوظ ہیں،

ملا جامیؒ ان الفاظ میں تصنیف و مصنف کی جلالت قدر کا اعتراف کرتے ہیں:۔

"عالم و عارف بود...... در صحبت بسیارے از مشائخ دیگر رسیدہ است،

صاحب کتاب کشف المحجوب است کہ از کتاب مشہورہ معتبرہ دریں فن است و

لطائف و حقائق بسیار در آں کتاب جمع کردہ است۔" (نفحات صفحہ ۳۵۸)

دارا شکوہ کے نزدیک فارسی زبان میں تصوف پر کوئی کتاب اس ٹکر کی نہیں:۔

"خانوادہ ایشاں خانوادہ زہد و تقوی بود، حضرت پیر علی ہجویری را تصانیف بسیار است اما کشف المحجوب مشہور و معروف است و ہیچکس را بر آں سخن نیست دمرشدے ست کامل، در کتب تصوف بہ خوبی آں در زبان فارسی تصنیف نہ شدہ خوارق و کرامات زیادہ از حد و نہایت، و بار ہا بر قدم تجرید و توکل سفر کردہ اند" (سفینہ صفحہ ۱۶۴)

سب سے بڑھ کر قابل استناد و قابل افتخار قول سلطان المشائخ نظام الملت نظام الدین اولیاء کی جانب منسوب ہے، آپ کا ارشاد نقل ہوا ہے کہ جس کا کوئی مرشد نہ ہو، اس کو کشف المحجوب کے مطالعہ کی برکت سے مل جائے گا، آپ کا ایک غیر مطبوعہ ملفوظ درر نظامی[1] اس میں ہے۔

"می فرمودند، کشف المحجوب از تصنیف شیخ علی ہجویری ست، قدس اللہ روحہ العزیز، اگر کسے را پیرے نہ باشد چوں ایں کتاب را مطالعہ کند او را پیدا شود، من ایں کتاب را بہ تمام مطالعہ کردم۔"

مخدومؒ کی اس کرامت کا ذکر متعدد تذکروں میں ہے کہ لاہور میں جو مسجد آپ نے تعمیر کرائی تھی۔ اس کی محراب میں بمقابلہ دوسری مسجدوں کے سمت جنوب میں ذرا کجی تھی، علمائے وقت نے اعتراض کیا کہ سمت قبلہ قائم نہیں رہی، آپ نے ایک روز سب کو جمع کر کے خود نماز پڑھائی، اس کے بعد حاضرین سے کہا دیکھ لو کعبہ کدھر ہے، حجابات اٹھ گئے، سب نے دیکھ لیا کہ بیت اللہ مسجد کے ٹھیک مقابل ہے۔

---

[1] درر نظامی۔ مرتبہ شیخ علی محمود جاندار، نسخہ قلمی، مملوکہ سید علیم الدین مرحوم خادم درگاہ سلطان المشائخ، دہلی۔

(ب) تصنیف

عربی میں تصوف کی قدیم ترین معلوم و موجود کتاب کا نام کتاب اللمع ہے، اس سے ہم پچھلے باب میں روشناس ہو چکے، فارسی میں تصوف کی قدیم ترین موجود کتاب کشف المحجوب ہے، کتاب اللمع چند سال قبل دنیا کے لئے معدوم تھی، اور اب بھی مشرق کے لئے اس کا وجود اس کے عدم سے کچھ ہی بہتر ہے، خوش قسمتی سے کشف المحجوب اس حجاب گمنامی میں نہیں، داتا گنج بخش لاہوری کا نام تو اس سے زیادہ عوام کی زبان پر ہے، پنجاب کے اکثر گھرانے ان کی عقیدت کے مسکن ہیں، لاہور میں مدت ہوئی اصل فارسی نسخہ طبع ہو چکا ہے، اور ترجمہ بھی لاہور ہی سے نکل چکا ہے، انگریزی ترجمہ پروفیسر نکلسن نے گب موریل سیریز میں شائع کیا ہے، چند سال ہوئے روس (سینٹ پٹرزبرگ) کے پروفیسر ژوکووسکی کے زیر اہتمام اصل کتاب کے یورپ میں بھی چھپنے کی اطلاع آئی تھی، یہ سب کچھ ہے، تاہم استفادہ کرنے والوں کا حلقہ اب بھی محدود ہے، اور مصنف کی طرح تصنیف سے بھی تعارف کرانے کی ضرورت ابھی باقی ہے،

مصنفؒ کی رحلت کا سال ۴۶۵ھ ہے، اور مصنفؒ نے اس کتاب میں اپنی متعدد پچھلی کتابوں کا ذکر اور سکونت لاہور کا ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان کی آخر عمر کی تصنیف ہے، یعنی پانچویں صدی ہجری کا وسط، اسی کتاب کے تقریباً ہم عمر امام ابو القاسم قشیریؒ کا عربی رسالہ القشیریہ ہے، موضوع اس کا بھی تصوف ہے، دونوں کے طرز تصنیف میں فرق یہ ہے کہ امام موصوف نے

زیادہ تر متقدمین کے اقوال وحکایات کے نقل کر دینے پر اکتفا کی ہے، بہ خلاف اس کے مخدوم ہجویری ایک مجتہدانہ انداز سے اپنے ذاتی تجربات، مکاشفات، واردات، مجاہدات وغیرہ بھی قلمبند کرتے جاتے ہیں، اور مباحث سلوک پر رد و قدح کرنے میں تامل نہیں کرتے، اس لئے ان کی کتاب کی حیثیت محض ایک مجموعۂ روایات وحکایات کی نہیں بلکہ ایک مستند محققانہ تصنیف کی ہے۔

صورت تصنیف یہ ہے کہ کوئی صاحب ابوسعید ہجویری نامی سائل ہیں، انھوں نے حضرت مخدوم رح سے عرض کیا ہے کہ

بیان کن مرا اندر تحقیق طریق تصوف	مجھ سے بیان فرمایئے طریق تصوف کی
و کیفیت مقامات ایشاں و بیان	حقیقت اور مقامات صوفیہ کی کیفیت
مذاہب و مقالات آں و اظہار	اور ان کے عقائد و مقالات کی تشریح،
کن مرا رموز و اشارات ایشاں و	اور مجھ پر ظاہر کیجئے ان کے رمز اور
چگونگی، محبت خدائے عز و جل و	اشارے اور خدائے بزرگ کیساتھ انکی
کیفیت اظہار آں بر دلہا و سبب	محبت کی نوعیت، اور دلوں میں اسکی
حجاب عقول از کنہ ماہیت آں و	ماہیت کے ادراک سے عقل کا حجاب
نفرت نفس از حقیقت آں و آرام	اور نفس کی اسکی طرف سے بیزاری اور
روح با صفوت آں، و آنچہ بدیں تعلق	روح کی اسکی طرف سے تسکین اور اس
دارد و از معاملت آں (ص۶)	کے معاملات کے متعلقات

ساری کتاب اسی سوال کے جواب اور انہی مراتب کی تفصیل میں ہے،

مضامین اور تصانیف کے سرقہ میں معلوم ہوتا ہے، اس وقت اور اس زمانہ کے لوگ بڑے شاطر تھے، شیخ کو ایک نہیں دو مرتبہ ان لوگوں کے ہاتھوں تلخ تجربے اٹھانے پڑے۔ ایک مرتبہ کوئی صاحب شیخ رح سے مسودہ دیوان مانگ کر لے گئے اور جلئے

واپس کرنے کے اپنے نام اور تخلص کے ساتھ اسکی اشاعت شروع کر دی دوسری مرتبہ یہ اتفاق ہوا کہ ان کی ایک تصنیف فن سلوک میں منہاج الدین کے نام سے تھی، اُسے کوئی شخص اڑا لے گیا، ان کا نام کاٹ کر عنوان پر اپنا نام لکھ دیا، اور اُن کی تصنیف کو اپنی جانب منسوب کرنا شروع کر دیا، کشف المحجوب ان تصانیف کے بعد کی ہے، اس کے آغاز میں جہاں اپنا نام لکھا ہے، وہاں اِن سب تلخ حالات کی تصریح بھی تلخ لب و لہجہ میں فرمادی ہے، (ص ۱-۲)

اس سرقہ سے اس قدر خائف تھے، کہ اسی ایک بار پر اکتفا نہیں کی بلکہ درمیان کتاب میں بار بار اپنا پورا نام لیتے گئے ہیں۔

لاہور کا جو مطبوعہ نسخہ پیش نظر ہے، اس کا کہنا چاہیئے کہ کوئی صفحہ مطبعی غلطیوں سے خالی نہیں۔ کہیں عبارت بالکل بے معنی ہو گئی ہے، کہیں مصنف کے اصل منشا کے خلاف مفہوم نکل رہا ہے، اور اس سے بڑھ کر ستم یہ ہے کہ اکثر مقامات پر اشخاص و مقامات کے نام بالکل مسخ ہو گئے ہیں، ان کی تصحیح کی کوئی صورت نہیں، دوسرا تکلیف دہ امر اس نسخہ میں یہ ہے، کہ کسی قسم کی فہرست مضامین وغیرہ درج نہیں، کتاب مقدمہ، بابوں اور فصلوں میں تقسیم ہے، ہر باب و فصل کے الگ الگ پیراگراف (بند یا فقرے) ہیں، لیکن کاتب صاحب نے بائے بسم اللہ سے لیکر تائے تمت تک ۴۴۲ صفحہ کی کتاب کا قلم بالکل یکساں رکھا ہے، نہ کہیں کوئی پیراگراف (بند) توڑا ہے، نہ ایک باب و فصل کے اختتام کو دوسرے کے آغاز سے نمایاں طور پر ممتاز کیا ہے۔ راقم سطور نے بطور خود ایک فہرست مضامین اور بعض دوسری فہرستیں مرتب کیں اور انہی کی مدد سے ناظرین کے ہمراہ کتاب پر ایک سرسری نظر کرتا ہے۔

شروع کے چھ صفحے (ص ۲-۸) بہ طور تمہید یا مقدمہ کے ہیں، ان میں سبب تالیف موضوع سخن وغیرہ کا بیان ہے، اس کے بعد ترتیب مضامین حسب ذیل ہے:-

(۱) فی اثبات العلم (صفحہ ۱۲)

اس میں علم کی ماہیت، علم کے فضائل اور علم کے اقسام کا بیان ہے، مشہور صوفی حاتم اصمؒ کا قول نقل کیا ہے کہ

حاتم الاصم گفت رضی اللہ عنہ کہ چہار علم اختیار کردم واز ہمہ علمائے عالم برستم ..... یکے آنکہ بدانستم کہ مرا رزقے ست مقسوم کہ زیادت وکم نہ شود از طلب زیادت برآسودم دو دیگر آنکہ بدانستم کہ خدائے را بر من حقے است کہ جز من کسے دیگر نتواند گزارد بہ ادائے آں مشغول گشتم، دیگر آں کہ دانستم کہ مرا طالبے ست یعنی مرگ کہ از وے نتوانم گریخت آں را بساختم، چہارم آں کہ دانستم کہ مرا خداوندے ست مطلع بر من، از وے شرم داشتم و از ناکردنی دست باز داشتم، (صفحہ ۱۲)

تمام علوم عالم میں سے میں نے چار چیزوں کا علم حاصل کر لیا، اور باقی علوم سے بے نیاز ہو گیا، اول یہ کہ رزق کی ایک مقدار مقسوم ہے اسمیں کمی بیشی نہیں ہو سکتی، اسلئے اس میں اضافہ کی طلبگاری سے نجات پا گیا، دوسرے یہ کہ خدا کی جانب سے میرے اوپر جو حق عائد ہیں، انکی بجا آوری میرے اوپر فرض ہے (نہ کہ کسی اور پر) اس سے انکی ادائی میں مشغول ہو گیا ہوں، تیسرے یہ کہ میرے تعاقب میں موت لگی ہوئی ہے، جس سے کسی طرح گریز ممکن نہیں اسلئے اس سے ملنے کی تیاری کرتا رہتا ہوں چوتھے یہ کہ خدا میرے حال کو دیکھتا رہتا ہے، اسلئے اس سے شرم کرتا اور ممنوعات سے بچتا رہتا ہوں۔

علم صحیح یا معرفت کے لئے علم ظاہر یا شریعت اور علم باطن یا طریقت کی حاجت ضروری ہے، صرف ایک کا وجود طالب کے لئے مضر ہوگا،

ظاہر ورزش معاملت و باطنش تصحیح نیت و قیام بر یک ازیں بے دیگرے

ظاہر سے مراد معاملات ہیں اور باطن سے تصحیح نیت، ان میں سے ایک کا وجود

محال باشد، ظاہر بے حقیقت باطن
نفاق بود و باطن بے ظاہر زندقہ،
و ظاہر شریعت بے باطن نقص بود
و باطن بے ظاہر ہوس، پس علم حقیقت
را سہ رکن است، یکے علم بذات خداوند
تعالیٰ و وحدانیت وے و نفی تشبیہ
از وے دیگر علم بہ صفات خداوند
تعالیٰ و احکام آن، و سہ دیگر علم بہ افعال
و حکمت وے، و علم شریعت را نیز
سہ رکن است، یکے کتاب، دیگر سنت
سہ دیگر اجماع امت، (ص۱۱)

بغیر دوسرے کے محال ہے، ظاہر بغیر
امتزاج باطن کے منافقت ہے،
اور باطن بغیر شمول ظاہر کے زندقہ ہے
شریعت کا ظاہر بلا باطن نقص ہے اور
باطن بلا ظاہر ہوس ہے، تو علم حقیقت
کے تین رکن ہوئے، ایک[1] علم ذات
خداوندی، توحید و نفی تشبیہ، دوسرے[2]
علم صفات، و احکام خداوندی، تیسرے[3]
علم افعال و حکمت افعال خداوندی،
علم شریعت کے بھی یہی تین رکن ہیں،
ایک کتاب دوسرے سنت تیسرے اجماع امت،

علم ذات خداوندی کی تعلیم اس قسم کی آیات قرآنی میں بکثرت ملتی ہے،
[1] فاعلم انہ لا الہ الا اللہ، [2] واعلموا انّ اللہ ھو مولٰکم، [3] الم تر الی ربک
کیف مد الظل، [4] افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت، [5] لیس کمثلہ شئ وھو السمیع
البصیر۔

نیز اس قسم کی احادیث نبوی ہیں کہ من علم انّ اللہ تعالیٰ ربہ و انی نبیہ حرم
اللہ تعالیٰ لحمہ و دمہ علی النار،

علم صفات خداوندی کی جانب رہبری اس قسم کی آیات کرتی ہیں:۔
[1] انہ علیم بذات الصدور، [2] واللہ علی کل شئ قدیر، [3] وھو السمیع البصیر،
[4] فعال لما یرید، [5] ھو الحی لا الہ الا ھو،

علم افعال خداوندی کی بابت اشارے اس قسم کی آیات میں ملتے ہیں،

۲۷ واللہ خلقکم وما تعملون، ۲۸ واللہ خالق کل شیٔ

علم شریعت کے رکن اوّل یعنی کتاب اللہ سے تمسک و اعتصام کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے، فیہ آیات محکمات ہن ام الکتاب رکن دوم یعنی سنت نبوی کا شاہد عادل یہ فرمان الٰہی ہے، وما آتکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا، رکن سوم یعنی اجماع اُمت کی دستاویز استنادیہ ارشاد حضرت رسالتؐ ہے کہ لایجتمع امتی علی الضلالۃ علیکم بالسواد الاعظم،

علم، بہ شمول علم شریعت کی اہمیت پر جتنا زور دیا ہے اس مزید اندازہ اقتباس ذیل سے ہو گا۔

محمد بن فضل البلخی گوید رحمۃ اللہ علیہ العلوم ثلثۃ علم من اللہ و علم مع اللہ و علم باللہ علم باللہ علم معرفت بود کہ ہمہ اولیاء و انبیاء بدو دانستہ اند و تا تعریف و تعرف وے نبود ایشاں وے را نہ دانستند علم من اللہ علم شریعت بود کہ آں از وے بما فرمان و تکلیف ست و علم مع اللہ علم مقامات و طریق حق و بیان درجات اولیا است پس معرفت بے پذیرفتن شریعت درست نیاید و ورزش شریعت بے اظہار مقامات راست نیاید ... ہر کرا

محمد بن فضلؒ بلخی کہتے ہیں کہ علم کی تین قسمیں ہیں، ایک علم من اللہ، دوسرے علم مع اللہ، تیسرے علم باللہ، علم باللہ علم معرفت ہے کہ انبیاء و اولیاء نے اسی ذریعہ سے معرفت باری حاصل کی ہے، اور بغیر اس کے انھیں معرفت حاصل نہ ہو سکی، علم من اللہ علم شریعت ہے، یعنی احکام الٰہی و فرائض عبدیت کا علم، علم مع اللہ علم مقامات طریقت و درجات اولیاء کا نام ہے، معرفت بغیر علم شریعت کے قبول کیے درست نہیں ہو سکتی، اور شریعت پر عمل بغیر مقامات ... رسی کے پورا نہ ہو پائے گا اور جسے ختم حر

علم معرفت نیست دلش بجہل	نہیں اس کے قلب پر جہل کی موت
مردہ ست وہر کرا علم شریعت	طاری ہے، اور جسے علم شریعت
نیست بہ نادانی بیمار ست	نہیں اس کا قلب مرض نادانی
(صہ ۱۲)	میں گرفتار ہے،

اسی تعلیم کی تائید میں بایزید بسطامی کا قول ہے کہ

عملت فی المجاهدة ثلثین سنة	میں نے تیس سال تک مجاہدہ کئے،
فما وجدت شیئاً اشد علی	لیکن کسی مجاہدہ کو علم وتحصیل علم
من العلم ومتابعته	سے بڑھ کر سخت نہیں پایا،

اور خود شیخ ہجویری کا بیان ہے کہ طبع انسانی کے لئے آگ پر چلنا راہ علم پر چلنے سے آسان تر ہے، اور ایک جاہل کے لئے پل صراط پر ہزار بار گذرنا اس سے آسان ہے، کہ علم کا ایک مسئلہ حل کرے، (صہ ۱۲)

آج جب کہ بعض خوش فہم صوفیہ نے ہر قسم کے علم پر مطلق صورت میں حجاب اکبر کا حکم لگا دیا ہے، علم شریعت کے یہ فضائل ایک شیخ الشیوخ کی زبان سے یقیناً حیرت کے کانوں سے سنے جائیں گے،

(۲) الباب الثانی فی الفقر، (صہ ۱۲-۲۴)

اس باب میں فضائل فقر و مسکنت کا بیان ہے، فضائل فقر میں متعدد آیات قرآنی موجود ہیں، مثلاً

للفقراء الذین احصروا فی سبیل الله لا یستطیعون ضرباً فی الارض یحسبهم الجاهل اغنیاء من التعفف (بقر۔ ع۔ ۳۷)

تتجافی جنوبهم عن المضاجع یدعون ربهم خوفاً وطمعاً (ع۔ ۵۔ ع ۲)

احادیث نبوی میں فضائل فقر کثرت سے وارد ہوئے ہیں، سرور کائنات صلعم خود

اپنے متعلق دعا میں یہ آرزو کیا کرتے تھے، کہ اے پروردگار مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین ہی وفات دے، حشر میں زمرۂ مساکین ہی میں اٹھا، ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے روز ارشاد باری تعالیٰ ہوگا کہ

ادنونی احبائی فیقول الملئکۃ	میرے دوستوں کو حاضر کرو، فرشتے عرض
من احباءک فیقول اللہ الفقراء	کریں گے کہ بارالٰہا تیرے دوست کون
والمساکین،	ہیں؟ ارشاد ہوگا کہ فقراء و مساکین،

عہد رسالت میں جو فقراء مہاجرین مسجد نبوی میں اسباب دنیوی سے قطع نظر کرکے محض عبادت الٰہی کے لئے بیٹھ گئے تھے، اور اپنے رزق کیلئے تکیہ محض مسبب الاسباب پر رکھے ہوئے تھے، ان کی خبر گیری اور ان کی رفاقت کے لئے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بارگاہ رب العزت سے تاکید ہوتی تھی، چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے،

ولا تطرد الذین یدعون ربہم بالغداوۃ والعشی یریدون وجہہ

(انعام۔ آیت ۵۲)

اور ایک دوسرے موقع پر فرمان ملتا ہے:۔

ولا تعد عیناک عنہم ترید زینۃ الحیوٰۃ الدنیا (کہف، آیت ۲۸)

ان تاکیدی احکام نے ان فقراء مہاجرین کو اس مرتبہ پر پہونچا دیا تھا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جہاں کہیں ان کو دیکھ لیتے تو انتہائے شفقت سے ارشاد فرماتے کہ میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں، کہ اللہ نے تمھارے بارے میں مجھ پر عتاب کیا! (ص ۱۴-۱۵)

اس کے آگے فقر کی حقیقت اور فقر کے آداب پر بحث کی ہے، اور غنا کے مقابلہ میں اس کی افضلیت پر دلائل قائم کئے ہیں۔

(۳) الباب الثالث فی التصوف (صفحہ ۲۲-۳۱)

تیسرا باب ماہیت تصوف پر ہے، حسب معمول شیخ نے اس باب کا بھی آغاز
قال اللہ و قال الرسول سے کیا ہے، چنانچہ کلام الٰہی میں انھیں اس باب کے مطابق
و مناسب یہ آیت ملی،

وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض هونا واذا خاطبهم الجاهلون
قالوا سلاماً (الفرقان، آیت ۶۳)

اور بطور حدیث کے اس کو پیش کیا ہے جو حدیث رسولؐ تو نہیں، البتہ کسی بزرگ امت
کا مقولہ معلوم ہوتا ہے،

من سمع صوت اهل التصوف فلا یومن علی دعائهم کتب عند الله
من الغافلین،

اس کے آگے شیخ سراجؒ کی طرح انھوں نے بھی لفظ صوفی اور اس کے اشتقاق
پر تفصیلی نظر کی ہے۔

مردمان اندر تحقیق این اسم بسیار
سخن گفته اند و کتب ساخته و گروہے
ازاں گفته اند که صوفی را ازاں
آں صوفی خوانده اند که جامۂ صوف
دارد و گروہے گفته اند که صوفی را
ازاں آں صوفی خوانند که از
صف اول باشد و گروہے گفته اند که
بداں صوفی گویند که تولا به اصحاب
صفہ رضی اللہ عنہم کردہ اند و گروہے
گفته اند که این اسم از صفا مشتق

اس نام کی تحقیق میں لوگوں کے مختلف
خیالات ہیں اور بہت سے قول ہیں،
ایک گروہ کے نزدیک چونکہ یہ لوگ جامہ
صوف میں ملبوس رہتے تھے، اس لئے
صوفی کہلائے، بعض کا خیال ہے کہ
لفظ صوفی کا ماخذ صف اول ہے،
یہ حضرات چونکہ صف اول میں رہتے
تھے، اس لئے لقب صوفی سے موسوم
ہوئے، ایک گروہ کا مسلک ہے، کہ
چونکہ ان لوگوں کو اصحاب صفہ سے

است وہر کسے را اندریں معنیٰ	خاص محبت تھی اس لئے یہ صوفی کہلایا ہے
اندر تحقیق ایں طریقت لطائف	ایک اور جماعت اس لفظ کا اشتقاق
بسیار است اما بہ مقتضائے	لفظ صفا سے بتاتی ہے اور ہر گروہ اپنی
لغت ازیں معنی بعید می باشد	تائید میں خوب خوب نکتہ پیدا کرتا رہتا
(صفحہ ۲۲)	ہے لیکن لغت سے کسی قول کی بھی تائید
	نہیں ہوتی۔

شیخ کے نزدیک صوفی وہ ہے جس کا قلب "صفا" (صفائی) سے لبریز ہو اور "کدر" (گندگی) سے خالی ہو، اور اس مرتبہ تک کاملان ولایت ہی پہونچ سکتے تھے۔

"صفا ضد کدر بود و کدر صفت بشر بود، و بہ حقیقت صوفی بود آنکہ او از کدر گزر بود۔" (صفحہ ۲۳)

"صوفی نامے ست کہ مر کاملان ولایت را محققاں بدیں نام خوانده اند" صفحہ ۲۵

چنانچہ دور اول کے مشائخ طریقت میں سے کسی بزرگ کا قول ہے کہ

من صفاہ الحب فہو صاف و	جس کسی کو محبت صاف کر دے وہ
من صفاہ الحبیب فہو صوفی	صافی ہے اور جسے محبوب اپنے لئے
(صفحہ ۲۵)	صاف کرلے وہ صوفی ہے،

اہل تصوف کے تین طبقے یاد رہے ہیں، صوفی[1]، متصوف[2]، مستصوف[3]، تینوں کی تعریف شیخ ہی کے لفظوں میں سننے کے قابل ہے:-

صوفی آں بود کہ از خود فانی	صوفی وہ ہے جو اپنے نفس سے فانی
بود و بحق باقی و از قبضۂ طبائع	ہو کر حق میں زندہ و باقی ہو، اور مادیت سے
رستہ و بہ حقیقت پیوستہ، و	گذر کر حقیقت تک رسائی حاصل کر چکا ہو
متصوف آنکہ بمجاہدہ ایں درجہ را	اور متصوف وہ ہے جو مجاہدہ کر کر کے

همی طلبیدو اندر طلب خود درابر معاملت ایشاں درست همی کند، و مستصوف آنکه از برائے مال و منال و جاه و حفظ دنیا خود را مانند ایشاں کرده و ازیں ہر دو چیز، ہیچ خبر ندارد تا حدے کہ گفتہ اند المستصوف عند الصوفیۃ کالذباب و عند غیرہم کالذباب، (صفہ ۲۵)

یہ راہ طے کر رہا ہو، اور اس منزل تک رسائی کی کوشش میں ہو، اور مستصوف وہ ہے جو محض جاہ و مال کیلئے دنیا طلبی کی خاطر، اپنے کو صوفیہ و متصوفہ کے مشابہ بنائے، اور حقیقۃً ان دونوں سے اسے بہرہ نہ ہو، کسی نے خوب کہا ہے کہ مستصوف صوفی کی نظر میں مکھی کی طرح حقیر ہوتا ہو اور دوسروں کی نظر میں بھیڑیے کی مانند جسکی غذا ہی گوشت اور خون ہے،

شیخ عالم معانی و حقائق ہی کے سیاح نہیں بلکہ شیخ سعدی کی طرح لفظی صنعت گری کے بھی ماہر ہیں، اور کتاب میں ادب و انشاء کے جلوے بار بار دکھاتے گئے ہیں، یہاں بھی آگے جو عبارت لکھی ہے، نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو:۔

صوفی صاحب وصول بود و متصوف صاحب اصول و مستصوف صاحب فضول،

صوفی صاحب وصول ہوتا ہو کہ اسے وصل مقصود ہو چکا ہوتا ہے، متصوف صاحب اصول ہوتا ہے کہ اصل صحیح پر قائم رہ کر احوال طریقت میں مشغول رہتا ہے، اور مستصوف صاحب فضول ہوتا ہے کہ اس کی قسمت میں حقیقت سے محجوبی اور معانی سے محرومی ہوتی ہے،

قدیم ترین صوفیہ نے صوفی اور تصوف کی جو تعریفات بیان کی ہیں، شیخ نے انھیں بھی

سنداً پیش کیا ہے، اور دور تک انھیں پیش کرتے چلے گئے ہیں، (صفحہ ۲۶-۱۹) مثلاً

(۱) الصوفی اذا نطقہ بان نطق عن الحقائق وان سکت نطقت عند الجوارح بقطع العلائق (ذوالنون مصریؒ)

حضرت ذوالنون مصریؒ کہتے ہیں کہ صوفی وہ ہے کہ جب وہ گفتار میں آتا ہے تو اسکی زبان حقائق کی ترجمان ہوتی ہے، اور جب خاموش ہوتا تو اسکے اعضا قطع علائق پر زبان حال سے شہادت دیتے رہتے ہیں۔

(۲) التصوف نعت اقیم العبد فیہ قیل نعت للعبد ام للحق فقال نعت الحق حقیقتہ ونعت العبد رسماً (جنید بغدادیؒ)

حضرت جنید بغدادیؒ کا ارشاد ہے کہ تصوف وہ صفت، جس میں بندہ کی اقامت کی گئی (یعنی اس کی ہستی ہے) لوگوں نے پوچھا کہ یہ صفت بندہ کی ہے یا حق کی؟ جواب دیا کہ حقیقتہً تو حق کی ہے صورۃً بندہ کی ہے،

(۳) التصوف ترک کل حظ للنفس (ابوالحسن نوریؒ)

حضرت ابوالحسن نوریؒ کا قول ہے کہ تصوف تمام حظوظ نفسانی کے ترک کا نام ہے،

(۴) الصوفیۃ ھم الذین صفت ارواحھم نصاروا فی الصف الاول بین یدی الحق (ایضاً)

انہی بزرگ کا یہ بھی قول ہے کہ صوفی وہ لوگ ہیں جن کی روحیں (آلائشوں سے) پاک ہو چکی ہیں، اور وہ رب العزت کے حضور میں صف اول میں حاضر ہیں۔

(۵) الصوفی الذی لا یملك ولا یملك (ایضاً)

انہی بزرگ سے یہ بھی منقول ہو کہ صوفی وہ ہے جو نہ خود کسی چیز کا مالک ہو، اور نہ کوئی اس کا مالک ہو،

(۶) التصوف رؤیۃ الکون بعین النقص بل غض الطرف عن الکون (ابو عمرو دمشقیؒ)

ابو عمرو دمشقیؒ ارشاد کرتے ہیں کہ تصوف نام ہے کائنات کی جانب عیب جوئی کی نگاہ سے دیکھنے کا، بلکہ سرے سے نہ دیکھنے کا،

(۷) التصوف شرك لانہ صیانۃ القلب عن رؤیۃ الغیر ولا غیر (شبلیؒ)

شیخ شبلیؒ فرماتے ہیں کہ تصوف ایک طرح کا شرک ہے، اسلئے کہ یہ نام ہے قلب کو "غیر" سے بچانے کا، حالانکہ "غیر" کا وجود ہی سرے سے نہیں،

(۸) التصوف صفاء السر من کدورۃ المخالفۃ (حصریؒ)

شیخ حصریؒ کا ارشاد ہے کہ تصوف نام ہے قلب کو مخالفت حق کی کدورت سے پاک رکھنے کا،

(۹) الصوفی لا یری فی الدارین مع اللہ غیر اللہ (شبلیؒ)

شبلیؒ سے یہ ارشاد بھی منقول ہو کہ صوفی دونوں جہانوں میں اللہ کے سوا اور کسی کو نہیں دیکھتا،

(۱۰) التصوف اسقاط الرؤیۃ للحق ظاهراً وباطناً، (علی بن بندار نیشاپوری)

شیخ علی بنؒ بندار نیشاپوری کا ارشاد ہے کہ تصوف یہ ہے کہ بجز حق ہی حق کے ظاہر اور باطن میں اور کچھ نہ نظر آئے،

اسی باب میں اہل تصوف کے مزید خصوصیات، ان کے معاملات اور انبیاء علیہم السلام کی پیروی میں ان کی کوششوں کو بیان کیاہے،

(۴) باب فی لبس المرقعات (صفحہ ۳۱-۳۹)

اس چوتھے باب میں مرقع پوشی (یعنی پیوند لگے ہوئے لبادہ اور گدڑی پہننے کی فضیلت کا ذکر ہے، اور اس دستور کو سنت رسولؐ اور آثار صحابہ سے ثابت کیا ہے،

(۵) باب فی ذکر اختلافهم فی الفقر والصفوۃ (صفحہ ۳۹-۴۲)

اس باب میں اس مسئلہ پر بحث ہے کہ فقر اور صفا دونوں میں افضل کون ہے؟ بعض صوفیہ نے فقر کو ترجیح دی ہے، اور بعض نے صفا کو، شیخ نے محاکمہ کرنا چاہا ہے پھر بھی بحث تشنہ رہ گئی ہے،

(۶) باب الملامۃ (صفحہ ۴۲-۴۷)

اس باب میں آیہ قرآنی ولا یخافون لومۃ لائم ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء (مائدہ۔ آیت ۵۴) کی تفسیر میں طریق ملامت کی ستائش کی ہے، اور یہ دکھایا ہے کہ اہل حق راہ حق میں کسی ملامت کی پروا نہیں کرتے، بلکہ خلق کی نظر میں رسوا اور مطعون ہو کر اپنی للہیت اور حق پرستی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں، اس طریق کے نشر و اشاعت کا سہرا شیخ ابوحمدون قصارؒ کے سر ہے،

حصول ملامت کی ممکن صورتیں تین ہیں،

(۱) پہلی صورت "راست رفتن" یعنی معمولی طور پر راہ راست پر چلتے رہنے کی ہے خلقت اس پر بھی اگر ملامت کرنے لگے، تو یہ خواہ مخواہ کی ملامت ہوگی،

(۲) دوسری صورت "قصد کردن" کی ہے، یعنی بالقصد ایسے فعل کا ارتکاب کرنا جس سے نفس کے حب جاہ کو صدمہ پہونچے، اور لوگ زبان طعن دراز کریں،

(۳) تیسری صورت "ترک کردن" کی ہے، یعنی قصداً کوئی عمل خلاف شریعت کرنا، یہ طریقہ سراسر نامحمود ہے، اور نتیجہ "کفر و ضلالت طبعی" ہوتا ہے،

آج جو سبز پوش یا سرخ پوش یا زرد پوش یا کسی اور رنگین لباس میں ملبوس اپنے کو

سلسلۂ ملامتیہ میں منسلک بتاتے اور طرح طرح کی خلاف شرع حرکتیں علانیہ کرتے رہتے ہیں، وہ عموماً اسی تیسرے طریقہ "ترک کردن" پر عامل ہیں، اور اپنی ان فاسقانہ بلکہ نیم کافرانہ روش کا نام فقر و تصوف رکھا ہے، شیخؒ نے گویا اسی طبقہ کو پیش نظر رکھ کر الفاظ ذیل لکھے ہیں:-

آنکہ طریقش ترک باشد خلاف شریعت چیزے بر دست گیرد و گوید کہ من طریق ملامت می ورزم آں ضلالت واضح باشد و آفت ظاہر وہوس صادق، چنانچہ اندریں زمانہ بسیارے ہستند کہ مقصود شان اندر خلق قبول ایشاں بود (صفحہ ۴۴)	تو جو کوئی اس طریق ترک کو اختیار کرتا ہے، اور کسی خلاف شریعت عمل کو کرکے کہتا ہے کہ میں اصول ملامتیہ کی پیروی کر رہا ہوں، تو اس کا یہ فعل کھلی ہوئی گمراہی اور روش معصیت اور تمام تر نفسانیت ہے، چنانچہ آجکل بہت سے لوگ ایسے پیدا ہوگئے ہیں جنکا مقصد طریق ملامتیہ کے پردہ میں نمود و نمایش ہے نہ کہ اسکا ترک،

اس کے آگے اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ ان کا ایک اسی طرح کے مصنوعی ملامتی کا ساتھ ہوگیا، اُس نے کوئی بدکرداری کی، اور اس سے یہی غرض ظاہر کی کہ ملامت حاصل ہو، ایک رفیق کار نے اس کے اس فعل پر اعتراض کیا، اس پر اُس نے آہ سرد کھینچی، شیخ نے کہا اگر ملامتی ہونے کے مدعی ہو اور اپنے اعتقاد میں سچے ہو تو اس رفیق کا ٹوکنا تمھیں گراں کیوں گذرا، تمھیں تو اور خوش ہونا چاہیئے کہ جو مقصود تھا (یعنی ملامت) وہی حاصل ہوا ہے،

شیخؒ کا یہ فقرہ بھی آج کل کے شریعت شکن دعویداران مشیخت و کرامت کے لئے بہت قابل غور ہے:-

ہر کہ خلق را دعوت کند بامرے از	جو شخص خلق کے سامنے دعوت حق

حق مر آں را برہانے باید، برہان آں حفظ سنت باشد، چوں از ترک فریضہ میم و تو خلق را بدان دعوت می کنی ایں کار از دائرہ اسلام بیروں می باشد (صفحہ ۴۵)

لیکن اُسے کا مدعی ہوتا ہے، اُسے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل بھی لانا چاہیئے اور یہ دلیل سنت رسول کی پابندی ہے، تم دعوت حق کے مدعی ہو، مگر جب تم نے ترک فریضہ کر دیا، تو یہ فعل دائرہ اسلام سے خارج ہے،

(۷) باب ذکر آئمتھم من الصحابۃ (صفحہ ۴۷-۵۱)

اس باب میں خلفاء اربعہ کا ذکر ہے، جو تمام صوفیوں کے سرگروہ و پیشوا ہوئے ہیں، اور اس میں قدرتہً سب سے زیادہ اہمیت حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ کو دی گئی ہے، حضرت صدیقؓ کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:۔

"شیخ الاسلام و بعد از انبیاء خیر الانام، خلیفہ و امام، سید اہل تجرید و شاہنشاہ ارباب تفرید و از آفات انسانی بعید، امیر المومنین ابو بکر عبد اللہ الصدیق کہ وے را کرامات مشہور ست و آیات و دلائل ظاہر .... و مشایخ وے را تقدم ارباب مشاہدت نہند۔"

اور علی مرتضیٰؓ کا ذکر ان الفاظ میں ہے:۔

"برادر مصطفےٰ و غریق بحر بلا و حریق نار ولا، مقتدائے جملہ اولیاء و اصفیاء ابو الحسن علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ اور اندریں طریقت شانے درجۂ رفیع بود.....

..... تا حدے کہ جنید گوید رحمۃ اللہ علیہ شیخنا فی الاصول والبلاء علی مرتضیٰ، شیخ ما اندر اصول و اندر بلا کشیدن علی مرتضیٰ ست، یعنی امام ما اندر علم طریقت و معاملات آں علی مرتضیٰ ست..... اہل ایں طریقت اقتدا کنند بہ او اندر حقائق عبادات و دقائق اشارات و تجرید از علوم دنیا و آخرت و نظارہ اندر تقدیر حق، و لطائف

کلام وے بیشتر از آن ست کہ بہ عدد اندر آید (صفحہ ۵۱)

تقریباً ایسے ہی شاندار الفاظ میں حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کے بھی مبارک تذکرے ہیں،

(۸) باب فی ذکر ائمتھم من اھل البیت (صفحہ ۵۱-۵۸)

یہ باب خاندان نبوی کے اخلاف صالحین کے کمالات و مناقب پر مشتمل ہے، خصوصاً سیّدنا حضرت حسنؓ و سیدنا حضرت حسینؓ، حضرت زین العابدین علی بن حسینؓ، حضرت ابو جعفر محمد باقرؒ، حضرت جعفر صادقؒ کے کمالات و کرامات پر،

(۹) باب فی ذکر اھل الصفۃ (صفحہ ۵۸-۶۰)

اصحاب صفہ کے حالات میں شیخ نے اپنی ایک مستقل تصنیف منہاج الدین کا حوالہ دیا ہے، اور اس باب میں صرف ان کے اسمائے گرامی کو شمار کر دیا ہے،

(۱۰) باب فی ذکر ائمتھم من التابعین (صفحہ ۶۰-۶۳)

یہ باب اویس قرنی، ہرم بن حیان، حسن بصری اور سعید بن المسیب، رحمۃ اللہ علیہم کے تذکروں پر مشتمل ہے، گویا تابعین میں صوفیہ کے سرخیل، پیشوا یہ حضرات ہوئے ہیں، حسن بصریؒ طبقۂ مفسرین میں اور سعید بن المسیب طبقۂ فقہا میں جانے پہچانے ہوئے نام ہیں،

(۱۱) باب ذکر ائمتھم فی تبع التابعین (صفحہ ۶۳-۱۱۶)

اس باب کے تحتانی عنوانات ۶۴ ہیں، اور ہر عنوان ایک ایک بزرگ کے تذکرہ کے لئے وقف ہے، امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، مالک بن دینارؒ، احمد حنبلؒ، حبیب عجمیؒ ذو النون مصریؒ، داؤد طائیؒ، معروف کرخیؒ، ابراھیم ادھمؒ، سری سقطیؒ، فضیل بن عیاضؒ، جنید بغدادیؒ، ابوبکر شبلیؒ، منصور حلاجؒ، ان چند پر سارے عنوانات کو قیاس کر لیا جائے، گویا طبقۂ تبع تابعین کے اکابر صوفیہ کی فہرست ابو حنیفہ، شافعی

و احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کے اسمائے گرامی سے شروع ہوتی ہے ،

(١٢) باب فی ذکر ائمتھم من المتاخرین (صفحہ ١١٦-١٢٣)

متاخرین صوفیہ میں جن دس بزرگوں کے حالات درج کئے ہیں ، ان میں شیخ ابوالحسن خرقانیؒ اور امام ابو القاسم قشیریؒ کے نام خاص طور پر قابل لحاظ ہیں ،

(١٣) باب فی ذکر الرجال الصوفیۃ من المتاخرین علی الاختصار من اھل البلدان (صفحہ ١٢٣-١٢٦)

یہ گویا باب ماقبل کا تکملہ ہے اس میں معاصر صوفیہ کا تذکرہ ہے ، اور ان کے طبقات کو ان کی وطنیت کی بنا پر تقسیم کیا ہے ، مثلاً صوفیۂ شام و عراق ، صوفیۂ پارس ، صوفیۂ قہستان ، آذربائیجان و طبرستان ، صوفیۂ کرمان ، صوفیۂ خراسان ، صوفیۂ ماوراء النہر ، صوفیۂ غزنین .

(١٤) باب فی فرق فرقھم فی مذاھبھم ، (صفحہ ١٢٦-٢٠٠)

کتاب کا سب سے طویل و ضخیم باب یہی ہے جس میں صوفیہ کے مختلف سلسلے اور انکے اصول اور باہمی اختلافات کا ذکر ہے ۔ اس وقت تک حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے استقصار میں کل بارہ سلسلے تھے ، ان میں سے دس مقبول اور اہل حق تھے ، اور باقی دو مردود اور اہل باطل تھے ،

دس مقبول سلسلوں کے نام مع ان کے بانیوں کے حسب ذیل ہیں :۔

(١) محاسبیہ ۔	(عبداللہ بن حارث محاسبیؒ)
(٢) قصاریہ ۔	(ابو حمدان قصارؒ)
(٣) طیفوریہ ۔	(بایزید بسطامیؒ)
(٤) جنیدیہ ۔	(جنید بغدادیؒ)
(٥) نوریہ ۔	(ابوالحسن نوریؒ)
(٦) سہیلیہ ۔	(سہل تستریؒ)
(٧) حکیمیہ ۔	(حکیم ترمذیؒ)
(٨) خرازیہ ۔	(ابوسعید خرازؒ)

(۹) خفیفیہ۔ (ابو عبداللہ خفیفؒ)

(۱۰) سیاریہ (ابو العباس سیاریؒ)

گیارہویں سلسلہ کا نام جو مردود دین اور اہل ضلالت کا ہے، سلسلۂ حلولیہ ہے، اس کا بانی ابو حلمان دمشقی ہوا ہے، بارہویں سلسلہ کا نام کہ وہ بھی مردود ہے درج کتاب نہیں، اس کا انتساب فارس کی جانب کیا جاتا ہے[1]، (صفحہ ۱۹۵)

اس باب میں تصوف کے اکثر مہمات مسائل پر بحث آگئی ہے، گو ضمناً۔ نوعیت مضامین کا اندازہ چند تحتانی ابواب کے عنوانات سے ہوگا حقیقت رضا۔ فرق بین الحال والقال، الکلام فی السکر والصحو، احکام فی حقیقۃ النفس ومعنی الھویٰ احکام فی مجاہدۃ النفس الکلام فی حقیقۃ الھویٰ، الکلام فی اثبات الولایت، الکلام فی اثبات الکرامت الکلام فی البقاء والفناء الکلام فی الغیبۃ والحضور، الکلام فی الجمع والتفرقہ، تفضیل الانبیاء والاولیاء علی الملائکۃ وقس علیٰ ہذا،

یہاں تک کتاب کا گویا تاریخی اور تنقیدی حصہ تھا، اس کے بعد سے مستقلاً مسائل سلوک کی تشریح شروع ہوتی ہے، اور کشف المحجوب میں حجابات کا کشف ہونے لگتا ہے، شیخ نے حجابات کی تعداد گیارہ قرار دی ہے، اور بعد کے ہر باب میں ایک ایک حجاب کو اٹھایا ہے، ہر باب کئی کئی حصوں میں تقسیم ہے، عنوانات ابواب پر سرسری نظر کافی ہوگی۔

(۱۵) کشف الحجاب الاوّل فی معرفۃ اللہ صفحہ ۲۰۰ تا صفحہ ۲۰۸

(۱۶) " " الثانی فی التوحید صفحہ ۲۰۸ تا صفحہ ۲۱۵

(۱۷) " " الثالث فی الایمان صفحہ ۲۱۵ تا صفحہ ۲۱۹

(۱۸) " " الرابع فی الطھارۃ صفحہ ۲۱۹ تا صفحہ ۲۲۶، (ایک تحتانی

---

[1] ملا جامی نے پورا نام فارس بن عیسیٰ بغدادی لکھا ہے، منصور حلاج کا مرید بتایا ہے اور بزرگوں میں شمار کیا ہے، (صفحہ ۱۷۳-۱۷۴۔ نفحات الانس، مطبوعہ کلکتہ)

باب توبہ و متعلقات توبہ پر ہے)

(۱۹) کشف الحجاب الخامس فی الصّلوٰۃ صفہ ۲۲۶ تا صفہ ۲۳۹، (ایک تحتانی باب محبت و متعلقات محبت پر ہے)

(۲۰) ” ” السادس فی الزکوٰۃ، صفہ ۲۳۹ تا صفہ ۲۴۴، (ایک تحتانی باب جود و سخا پر ہے)

(۲۱) ” ” السابع فی الصوم صفہ ۲۴۴ تا صفہ ۲۵۰ (ایک تحتانی باب بھوک پر ہے)

(۲۲) ” ” الثامن فی الحج صفہ ۲۵۰ تا صفہ ۲۵۷ (ایک تحتانی باب مشاہدہ پر ہے)

(۲۳) ” ” الحجاب التاسع فی الصحبۃ صفہ ۲۵۷ تا صفہ ۲۸۶)

صحبت کو جو مرتبہ اہمیت سلوک و طریقت میں حاصل ہے، اس کے لحاظ سے یہ بالکل قدرتی ہے کہ یہ باب مبسوط و مفصل ہے، آداب و احکام صحبت کی تفصیل میں یہ باب بجائے خود دس تحتانی ابواب پر تقسیم ہے، بعض کے عنوانات حسب ذیل ہیں:۔

باب آدابہم فی الصحبۃ، باب آدابہم فی السفر، باب آدابہم فی الاکل، باب آدابہم فی المشی، باب آدابہم فی الکلام والسکوت، باب آدابہم فی التزویج و التجرید،

(۲۴) کشف الحجاب العاشر فی بیان منطقہم وحدود الفاظہم وحقائق معانیہم (صفہ ۲۸۶ تا صفہ ۳۰۶)

اس باب میں پہلے ارباب سلوک و طریقت کے مصطلحات کا ذکر ہے، ان کے معنی اور ان کے باہمی فرق کی تشریح ہے،

مثلاً حال و وقت، مقام و تمکین، محاضرات و مکاشفات، قبض و بسط، مہر و لطف، انس و ہیبت، نفی و اثبات، علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین، علم معرفت و شریعت و حقیقت، وغیرہ،

مباحث کی نوعیت کا اندازہ اقتباس ذیل سے ہوگا، بیان شریعت و حقیقت کے

تعلق باہمی کا ہو رہا ہے،

شریعت فعل بندہ بود و حقیقت
داشت خداوند و حفظ و عصمت
وے، پس اقامت شریعت بے وجود
حقیقت محال باشد و اقامت
حقیقت بے حفظ شریعت ہم محال،
و مثال ایں چوں شخصے باشد زندہ
بر جان و چون جان از وے جدا
شود آں شخص مردارے باشد
و جان چوں بادے گر قیمت شاں
از مفارقت یک دیگر ست ہمچنیں
شریعت بے حقیقت ریائے بود و
حقیقت بے شریعت نفاق، و خدا
وند گفت "والذین جاھدوا
فینا لنھدینھم سبلنا مجاہدت
شریعت آمد و ہدایت حقیقت آں
یکے حفظ بندہ باشد مر احکام ظاہر
را بر خود و آں دیگر حفظ حق بود مر
احوال باطن را بر بندہ پس شریعت
از مکاسب بود و حقیقت از مواہب
(صفحہ ۳۰)

شریعت بندہ کا فعل ہے اور داشت
خداوندی، حفظ و عصمت الٰہی کا نام
حقیقت ہے، پس شریعت کا تحقق
بلا وجود حقیقت کے محال ہے، ان کے
باہمی تعلق کی مثال روح و جسم کے اتصال
کی ہے، جبتک انسان زندہ ہو دونوں
متصل ہیں، جب روح نکل گئی تو جسم
مردہ ہو گیا، اور روح خود بس اب ہوا
ہو گئی، دونوں کی اہمیت و قدر اسی
وقت تک ہے، جبتک ایک دوسرے کے
شریک رفیق ہیں، اسی طرح شریعت بغیر
مغز حقیقت کے ایک ریاکاری ہو۔ اور
حقیقت بھی بغیر امتزاج شریعت کے
منافقت ہو، قرآن مجید میں ہے کہ جو
لوگ ہماری راہ میں جد و جہد کرتے رہتے
ہیں انھیں ہم اپنی راہیں دکھا کر رہیں گے،
اس مجاہدہ (جد وجہد) کا نام شریعت
ہو اور جو ہدایت در راہ یابی، اس پر
مرتب ہوتی ہے۔ اس کا نام حقیقت
ہے، شریعت کا ماحصل احکام ظاہر کی

تعمیل ہے اور حقیقت کا خلاصہ احوال
باطن کا اپنے اوپر طاری کرنا، شریعت
بندہ کے اختیار کی چیز ہے، اور حقیقت
عطیۂ الٰہی ہے،

اس کے بعد مختصر طور پر اور بہت سے مصطلحات صوفیہ، مثلاً حق، حقیقت، ذات، صفت وجوہر کے معنی درج کئے ہیں،

(۲۵) کشف الحجاب الحادی عشر فی السماع، صفحہ ۳۰۶ تا صفحہ ۳۲۸

کتاب کا یہ آخری جزو بجائے خود دس بابوں میں تقسیم ہے، باب سماع القرآن، باب سماع الشعر، باب سماع الاصوات والالحان، باب فی احکام السماع، باب اختلافہم فی السماع، باب مراتبہم فی السماع، باب فی الوجد والتواجد، باب فی الرقص، باب فی الخرق، باب فی آداب السماع،

شیخ کے نزدیک سماع کی بہترین صورت سماع آیات قرآنی ہے، فرماتے ہیں۔

"اولیٰ ترین سماع مسموعات مر دل رابہ فوائد سر رابہ زوائد وگوش رابہ لذت کلام خداوند عز اسمہ ست و مامور ند ہمہ مومناں و مکلف اند ہمہ کافراں از آدمی و پری بشنیدن کلام ایزد تعالیٰ (صفحہ ۳۰۷)

سماع قرآن کی افضلیت تو بہر حال کسی مسلمان کے لئے قابل بحث ہے ہی نہیں، گفتگو جو کچھ ہے وہ سماع مصطلح یعنی غنا یا شعر کو لحن کے ساتھ سننے کی ہے، شیخ خود صاحب سماع تھے، اور اپنے عمل کی تائید میں آثار صحابہ بلکہ عمل رسول تک رکھتے تھے، (صفحہ ۳۱۱ وصفحہ ۳۱۶) چنانچہ ابو عبد الرحمن سلمی کی کتاب السماع کا حوالہ دیا ہے، جس میں انہوں نے جواز سماع کی تائید میں احادیث رسول صلعم وآثار صحابہ کو نقل کیا ہے، (صفحہ ۳۱۱) تاہم فرماتے ہیں کہ

مراد مشایخ متصوفہ از یں طلبیدن مشایخ صوفیہ کو تلاش اباحت سماع

بجز اباحت ست از انچہ اعمال فوائد
باید اباحت طلبیدن کار عوام باشد
در محل مباح ستور انند بندگان مکلف
را باید کہ از کردار فائدہ طلبند

کی نہیں رہتی، اس لئے کہ کسی عمل کو
اس کی اباحت کی بنار پر نہیں، اس
کے فوائد کی بنار پر اختیار کرنا چاہیئے،
تلاش اباحت میں صرف عوام رہتے
ہیں، سند جواز چوپایوں کے لئے کافی
ہو سکتی ہے، انسان کے لئے تکلیف شرعی
رکھی گئی ہے، اسے چاہیئے کہ کسی عمل
کو اس کے فوائد کی بنار پر اختیار کرے،

اس کے آگے اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کرتے ہیں، جو اس مسئلہ پر بہت سلجھے ہوئے
قول فیصل کا حکم رکھتا ہے، اور بہت سے پہلوؤں کا جامع ہے، کہتے ہیں:۔

وقتے من بمرو بودم، یکے از آئمہ اہل
حدیث کہ معروف ترین ایشاں بود مرا گفت
کہ من اندر اباحت سماع کتابے کردہ
ام، گفتم بزرگ مصیبتے کہ اندر دین پدیدار
آمد کہ خواجہ امام لہوے را کہ اصل ہمہ
فسقہاست حلال کردی مرا گفت پس اگر
حلال نمی دانی، تو چرا می کنی، گفتم حکم
ایں بر وجوہ ست، بر یک چیز قطع نتواں
کرد، اگر تاثیر اندر دل حلال بود سماع
حلال بود و اگر حرام بود حرام و اگر مباح
بود مباح، چیزے را کہ حکم ظاہرش فسق

ایک زمانہ میں میں مرو میں تھا، ایک روز
وہاں کے مشہور ترین امام اہلحدیث نے
مجھ سے کہا کہ میں نے جواز سماع پر ایک
کتاب تصنیف کی ہے میں نے کہا کہ حضرت
یہ تو آپ نے بڑا غضب کیا کہ ایسے لہو کو
حلال کر دیا جو ہر فسق کی جڑ ہے، اس پر
وہ بولے کہ اگر آپ حلال نہیں سمجھتے تو پھر
خود کیوں سنتے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ
اس کا حکم مختلف حالات پر منحصر ہے، کوئی
ایک حکم قطعی طور پر نہیں لگایا جا سکتا، اگر
سماع سے دل میں اثرات بھی حلال قسم

است واندر باطن حالش ردشن بر وجوہ است، اطلاق آں بہ یک چیز محال باشد (صہ ۳۱۶)	کے پیدا ہوں تو سماع حلال ہے، اور اگر حرام قسم کے پیدا ہوں تو حرام ہے، اگر مباح پیدا ہوتے ہوں تو مباح ہے، ایسی چیز کہ جس کے ظاہر پہ حکم فسق کا ہو اور جس کا باطن مختلف احوال کا تابع ہے، اس پر کوئی ایک قطعی حکم لگا دینا ممکن نہیں،

کتاب کے آخری جزو کے آخری باب کا عنوان آداب السماع ہے، اور اس پر گویا شیخؒ نے آداب واصول طریقت کا خاتمہ کر دیا ہے، اس میں شیخ نے شرائط سماع حسب ذیل تحریر کئے ہیں:۔

(۱) خواہ مخواہ اور تکلف کر کے سماع نہ سنے، جب تقاضا از خود غالب ہو، اس وقت سُنے۔

(۲) سماع بہت کثرت سے کبھی نہ سُنے کہ طبیعت اس کی خوگر ہو جائے، کبھی کبھی سُنے تاکہ ہیبت سماع دل پر قائم رہے۔

(۳) مرشد یا شیخ طریقت محفل سماع میں موجود رہے،

(۴) محفل میں عوام شریک نہ ہوں۔

(۵) قوال پاکباز ہو، فاسق نہ ہو،

(۶) قلب مکروہات دنیوی سے خالی ہو،

(۷) طبیعت لہو ولعب کی جانب آمادہ نہ ہو،

(۸) تکلف واہتمام نہ کیا جائے،

تاثیر سماع کے چند موثر واقعات وحکایات درج کرنے کے بعد، اور یہ تسلیم کر کے کہ

سماع بعض صورتوں میں اور بعض موقعوں پر نفسِ انسانی کا بڑا مصلح ہوتا ہے، شیخ اپنے کو یہ تلخ تجربہ بھی قلمبند کرنے پر مجبور پاتے ہیں کہ

اندریں زمانہ گروہے گمشدگان
بر سماع فاسقان حاضر شوند و
گویند کہ سماع از حق می کنیم و فاسقان
از آنکہ ایشان مر ایشان را اندر آں
موافقت کنند بر سماع کردن و بر فسق
و فجور حریص تر شوند تا خود ایشان
ہلاک شوند (صفحہ ۳۲۱)

اس زمانہ میں گمراہوں کا ایک بڑا گروہ
پیدا ہو گیا ہے، یہ فاسقوں کی محفل
سماع میں شریک ہوتا ہے، اور کہتا
ہے کہ ہم سماع حق کے لئے سنتے ہیں،
حالانکہ فاسق اس سے فسق و فجور پر اور
زیادہ حریص ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہ
اور وہ دونوں برباد ہو جاتے ہیں،

حالانکہ سماع کی غایت تو یہ ہونی چاہیئے، کہ

فائدہ ایں حکایت آن ست کہ
مرید را اندر غلبۂ سماع حالی چنیں
بباید کہ سماع وے فاسقان را از فسق
نجات دہد، ص۳۲۱

مرید کو سماع میں ایسی کیفیت پیدا
ہو جائے، جس سے دوسرے فاسق
فسق سے نجات پا جائیں،

شیخ تمامتر منکرین سماع میں نہیں، جب ان کا معیار یہ تھا، تو انہی کے معیار سے آج نو سو سال کے بعد جب فضا کہیں بڑھ کر فاسقانہ اور ماحول کہیں بڑھ کر عامیانہ ہو چکا ہے، آج کی قوالی کی محفلیں، جن میں شریک ہونے والے خواص سے کہیں زیادہ عوام ہوتے ہیں، اور پیشہ ور قوال تو گویا تمامتر ہی فسق پیشہ ہوتے ہیں اور ستار اور طنبورہ اور ہارمونیم اور طرح طرح کے باجوں کا رواج عام طور سے ہو چکا ہے، کس حکم میں داخل ہوں گی؟

(۳) رسالۃ القشیریۃ[1]

(امام ابو القاسم قشیریؒ)

(الف) مصنّف

تذکروں میں حالات بہت ہی مختصر ملے، اسم گرامی ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن القشیری تھا، لقب زین الاسلام، مولد خراسان، مدفن نیشاپور، تاریخ ولادت بہ قول شیخ الاسلام زکریا انصاری شارح رسالہ ربیع الاول ۳۷۶ھ ہے، تاریخ وفات ۱۶ ربیع الثانی ۴۶۵ھ ہے، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، عمر اس حساب سے ۸۹ سال کی ہوتی ہے،

ابھی بچہ تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ابتدائی تعلیم ابو القاسم یمانی سے حاصل کی، یہ عربی زبان و ادب کے نامور استاد تھے، خدارسی کے شوق میں شیخ وقت ابو علی دقاق کی خدمت میں حاضر ہوئے، ارشاد ہوا کہ پہلے علوم دینی میں کمال حاصل کرو، حکم کی تعمیل میں تفسیر، حدیث، کلام، اصول، فقہ، نحو، شعر، وغیرہ، علوم متداول میں

---

[1] ماخذ:- (۱) تذکرۃ الاولیاء عطار جلد اوّل
(۲) مدینۃ العلوم ازنیقی (نسخہ قلمی)
(۳) سفینۃ الاولیاء، داراشکوہ (لکھنؤ)
(۴) بستان المحدثین شاہ عبد العزیز دہلوی (لاہور)
(۵) نفحات الانس جامی (کلکتہ)
(۶) رسالۃ القشیریہ (مصر) سرورق
(۷) تاریخ بغداد خطیب بغدادی، (۱۲ مجلدات (مصر)

مہارت حاصل کی، جن استادوں سے استفادہ کیا، وہ اپنے وقت کے ماہرین فن تھے، مثلاً ابوالحسن بن بشروق، ابونعیم اسفرائینی، ابوبکر طوسی، ابوبکر فورک، ابو اسحٰق اسفرائینی وغیرہم،

علوم ظاہری سے فراغت کے بعد ابو علی دقاق کی خانقاہ تصوف و فقر میں قدم رکھا، اور ان ہی کی صاحبزادی سے عقد بھی کیا[1]،

ان کی وفات کے بعد شیخ ابوعبدالرحمٰن سلمی (صاحب طبقات الصوفیہ) سے مستفید ہوتے رہے، بیعت شیخ دقاقؒ ہی سے تھی، رسالہ میں ان کا ذکر خاص عقیدت کے ساتھ کیا ہے، اور ان کے نام کے ساتھ لقب استاد کا اضافہ کرتے گئے ہیں،

تصانیف متعدد چھوڑیں، مختلف فنون پر اور فاضلانہ، شیخ ہجویریؒ باوجود معاصرت فرماتے ہیں:۔

" اندر ہر فن اورا لطائف بسیار است و تصانیف نفیس جملہ با تحقیق "
(کشف المحجوب صہ ۱۳۱)

شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے تصانیف ذیل کی تصریح کی ہے،

(۱) رسالۃ القشیریہ (۲) نحو القلوب،
(۳) ایک عظیم الشان تفسیر القرآن[2] (۴) لطائف الاشارات
(۵) کتاب الجواہر (۶) کتاب احکام السماع

---

[1] یہیں سے ہمارے زمانہ کے جاہل مشائخ اور پیرزادوں کے اس جاہلانہ خیال کی بھی تردید ہو رہی ہے کہ پیر و شیخ کی لڑکی سے نکاح کرنا سوء ادب میں داخل ہے،

[2] " تفسیرے ست نہایت کلاں و آں بہترین تفاسیر است۔ " (بستان المحدثین)
" ہو من اجل التفاسیر واوضحہا۔ " (مدینۃ العلوم)
علمائے عصر میں ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ (نظام القرآن) کی زبان سے بھی ایسی ہی تعریف سننے میں آئی ہے۔

(۷) کتاب آداب صوفیہ	(۸) کتاب عیون الاجوبۃ

(۹) کتاب المناجات	(۱۰) کتاب المنتہی،

مدینۃ العلوم میں جو فہرست تصانیف دی ہے، وہ اس سے کسی قدر مختلف ہے،
عبادت میں شغف و اہتمام کا اندازہ اس سے ہوگا کہ مرض الموت میں نفلیں تک نہ
چھوٹنے پائیں، اور نمازیں برابر کھڑے ہوکر ادا کرتے رہے،
سلوک و طریقت میں جو پایہ رکھتے ہیں، اس کا حال معاصر بزرگ شیخ ہجویری کی
زبان سے سنئے:۔

استاد امام و زین الاسلام ابو القاسم
عبد الکریم بن ہوازن القشیری اندر
زمانہ خود بدیع بود و قدرش رفیع
و منزلتش بزرگ، و معلوم است اہل
زمانہ را روزگار وے و انواع فضلش
و اندر ہر فن ازر لطائف بسیار
است و تصانیف نفیس جملہ با تحقیق
و خدا وند تعالیٰ حال و زبان وے
را از حشو محفوظ گردانیدہ بود،
(کشف المحجوب صد ۱۳۱)

استاد امام و زین الاسلام ابو القاسم
عبد الکریم بن ہوازن القشیری اپنے
زمانہ میں فرد تھے اور بڑے بلند پایہ،
ان کی عظمت اور ان کا علم و فضل
سب کو معلوم و مسلّم ہے، ہر فن میں
ان کی کتابیں اور ان کے مسائل موجود
ہیں، اور ان کی جملہ تصانیف اعلیٰ و
با تحقیق ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے
حال اور زبان کو لغو سے پاک
کر دیا تھا،

مدینۃ العلوم کی عبارت ذیل سے معلوم ہوتا ہے، کہ فاضل ہمہ دان اور مختلف
علوم و فنون کے جامع تھے:۔

کان جامعاً بین اشتات العلوم، کان فقیہاً اصولیاً محققاً محدثاً مفسراً متقناً
نحویاً لغویاً کاتباً شاعراً،

منصور حلاج کے حال سے متعلق خود صوفیہ کے گروہ کے اندر تردد و تذبذب اور اختلاف رائے ہے، امام قشیری ہی کا مقولہ ذیل ان کے باب میں قول فیصل سمجھا گیا ہے:-

چنانکہ استاد ابو القاسم قشیری گفت در حق او کہ اگر مقبول بود بہ رد خلق مردود نہ گردد و اگر مردود بود بہ قبول خلق مقبول نہ گردد، (تذکرۃ الاولیا عطار - جلد ۲ صفحہ ۱۳۷)

اگر وہ مقبول تھے، تو خلق کے انکار سے مردود نہ ہو جائیں گے اور اگر مردود تھے تو خلق کے قبول سے مقبول نہ ہو جائیں گے،

شیخ ابو الحسن خرقانی کی عظمت سے قلب بہت زیادہ متاثر تھا، صاحب کشف المحجوب براہ راست روایت کرتے ہیں کہ

از استاد ابو القاسم قشیری شنیدم کہ چوں من بہ ولایت خرقان اندر آمدم، فصاحتم برسید و عبارتم نماند از حشمت آں پیر و پنداشتم کہ از ولایت خود معزول شدم (ص ۱۶۳)

استاد ابو القاسم قشیری مجھ سے فرماتے تھے کہ جب میں علاقہ خرقان میں پہنچا تو اس بزرگ کی ہیبت ایسی طاری ہوئی کہ گویائی جاتی رہی اور تاب گفتگو نہ رہی، اور خیال یہ پیدا ہوا کہ ولایت سے معزول کر دیا گیا ہوں،

یہ قول شیخ فرید الدین عطار نے بھی نقل کیا ہے، تذکرۃ الاولیا، جلد ۲، صفحہ ۲۰۷،

بغداد اس وقت عروس البلاد تھا، ۴۴۸ھ میں اپنی عمر کے ۶۲ سال میں وہاں آئے، رسالہ اس سے ۱۱ سال قبل ۴۳۷ھ میں تصنیف کر چکے تھے، بغداد آکر حدیثوں کی روایت کی، معاصر مورخ خطیب بغدادی کی روایت ہے،

قدم علینا فی سنۃ ثمان و اربعین و اربع مائۃ وحدث ببغداد

کتبنا عنہ (تاریخ بغداد جلد ۱۱ صفحہ ۸۳)

عقائد میں اشعری اور فقہ میں شافعی تھے، ثقہ اور واعظ خوش بیان ہونے کی شہادت بھی اسی معاصر مورخ کی زبان سے موجود ہے،

کان ثقة وكان يقص وكان حسن الموعظة وملیح الاشارة وكان يعرف الاصول على مذهب الاشعری والفروع على مذهب الشافعی (ایضاً)

صاحب کشف المحجوب نے قشیری کے متعدد اقوال اپنے ہاں نقل کئے ہیں، ان میں سے دو نمونہ کے طور پر حاضر ہیں :-

(۱) مردان اندر فقر و غنا سخن گفته اند و خود را اختیارے کرده و من آں اختیار کنم کہ حق مرا اختیار کند، مرا اندر آں نگاه دارد، اگر تونگر دارد م غافل نہ باشم واگر درویش خواهدم حریص و معترض باشم (صفحہ ۱)

لوگوں کے اقوال فقر و تونگری کے باب میں مختلف ہیں، کسی نے ایک کو اپنے لئے اختیار کیا ہے کسی نے دوسرے کو لیکن میں اسی شے کو اختیار کئے ہوئے ہوں جو اللہ میرے لئے اختیار کر دے اور جس میں مجھے رکھے، اور اگر تونگر بنا کر رکھے تو غافل نہ ہوں گا اور اگر فقیر بنا کر رکھے تو حریص و نافرمان ہو کر نہ رہوں گا،

(۲) مثل الصوفی کعلة البرسام اوله هذیان وآخره سکوت فاذا تمکنت خرست

صوفی کی مثال مرض برسام کی سی ہے جس کی ابتدا میں ہذیان ہوتا ہے اور آخر میں سکوت یعنی جب تم کمال کو پہنچ جاتے ہو تو زبان گنگ ہو جاتی ہے،

شیخ عطارؒ کی روایت ہے کہ قشیریؒ سماع کے قائل نہ تھے، در نقل است کہ استاد ابوالقاسم سماع را معتقد نہ بود۔" (جلد ۲ صفحہ ۲۳۲) لیکن خود رسالہ میں انکار صریح

نہیں پایا جاتا،

عطار ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ استاد ابو القاسم سماع کے منکر تھے، ایک روز شیخ ابوسعید کے سامنے سے گذرے وہاں محفل سماع گرم تھی، استاد نے اپنے دل میں کہا کہ جو لوگ یوں برہنہ سر، برہنہ پا، مارے مارے پھرتے ہیں، شریعت میں انکا ثقہ ہونا مستند نہیں، اور ان کی گواہی کا اعتبار نہیں، شیخ نے اُسی وقت ایک شخص کو دوڑایا کہ استاد سے ذرا پوچھو کہ ہم کب بہ حیثیت گواہ حاضر ہوئے تھے جو ہماری گواہی کے معتبر ہونے نہ ہونے کا سوال پیدا ہوا؟

بڑوں کی بعض باتیں بڑے ہی سمجھ سکتے ہیں، عطارؒ نے ایک طویل حکایت اور درج کی ہے، (جلد ۲ صہ ۲۳۱ و ۲۳۳) اس کا صرف خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے، روایت کی ذمہ داری حضرت عطارؒ پر ہے،

جس صبح کو شیخ ابوسعید ابوالخیر نیشاپور وارد ہونے والے ہیں، اسی شب میں خود استاد قشیریؒ اور ان کے تیس مریدوں نے خواب میں دیکھا کہ آفتاب زمین پر اتر آیا ہے، صبح کو شیخ کے ورود کا غلغلہ ہوا، استاد نے اپنے حلقہ نشینوں کو شیخ کے پاس حاضر ہونے سے منع کر دیا۔ لیکن جن شاگردوں نے خواب دیکھا تھا سب حاضرِ خدمت ہوئے۔ استاد کو اس سے ملال ہوا اور وہ خود شیخؒ سے ملنے نہ آئے، ایک روز سرِ منبر استاد نے فرمایا کہ مجھ میں اور ابوسعید میں یہ فرق ہے کہ ابوسعید خدا کو چاہتے ہیں اور خدا مجھ کو، پس ان کے اور میرے وہ نسبت ہے جو ذرہ کو کوہ سے ہوتی ہے۔ کسی نے یہ مقولہ شیخ سے نقل کر دیا، شیخ نے فرمایا کہ "میں تو کچھ بھی نہیں ہوں، ذرہ اور کوہ سب وہی ہیں" استاد نے یہ خبر سنی تو اور زیادہ اشتعال پیدا ہوا، اور سرِ منبر کہہ دیا کہ جو شخص ابوسعید کی مجلس میں جائے گا وہ بد نصیب و مردود ہے، اسی شب میں خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی کہ جیسے حضورؐ کہیں

تشریف لئے جارہے ہیں، عرض کی کہ قصدِ مبارک کہاں کا ہے؟ ارشاد ہوا کہ "مجلس ابوسعیدؒ کا، کہ جو شخص وہاں حاضر نہ ہوگا وہ بدنصیب یا مردود ہے"۔ استاد گھبرا کر بیدار ہوئے اور وضو کرکے شیخ کی مجلس میں حاضر ہوئے، یہاں پہونچ کر شیخ کی ظاہری شان و شوکت دیکھی تو پھر ایک بار بدگمانی پیدا ہوئی، اور دل میں خطرہ گذرا کہ شیخ علم و فضل میں مجھ سے زائد نہیں، ہم مرتبۂ روحانی میں ہم پلہ ہیں، پھر انھیں یہ اعزاز و اکرام کہاں سے حاصل ہوا؟ شیخ پر استادؒ کے اس خطرہ کا کشف ہوگیا، رات کے واقعات کا پتہ دینا شروع کیا۔ اب استاد کے شبہات دور ہوگئے اور طبیعت بالکل صاف ہوگئی۔ شیخ جب منبر سے اترے، تو دونوں صاحب بغلگیر ہوئے، استادؒ اپنے خیالات سے تائب ہوئے، ربط باہمی اتنا بڑھا کہ ایک روز اپنے پہلے قول کی تردید کی، اور برسرِ منبر فرمایا کہ "جو شخص ابوسعیدؒ کی مجلس میں حاضر نہ ہو وہ مہجور یا مطرود ہے۔" واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

(ب) تصنیف

کتاب کا پورا نام رسالۃ القشیریہ فی علم التصوف ہے، متاخرین نے اکثر صرف الرسالہ کے نام سے ذکر کیا ہے، سالِ تصنیف کی تصریح خود دیباچہ میں موجود ہے، سنہ ۴۳۷ھ گویا شیخ ہجویری کی فارسی کشف المحجوب سے چند سال قبل تصوف کے موجودہ قدیم ذخیرہ میں شہرت و استناد کا جو مرتبۂ امتیاز اس رسالہ کو حاصل ہے، کمتر کسی کے نصیب میں آیا ہے۔ کتاب اللمع کا پتا لگنے سے قبل اسی کو تصوف کی قدیم ترین کتاب سمجھا جاتا تھا۔

الرسالہ کی مخاطب ممالکِ اسلامی کی معاصر جماعتِ صوفیہ ہے،

کتبہا الفقیر الی اللہ تعالیٰ عبدالکریم　　　اس رسالہ کو فقیر عبدالکریم بن ہوازن

ابن هوازن القشيري الى جماعة الصوفية ببلد ان الاسلام (۳۰۰) قشیری نے اسلامی ممالک کی جماعت صوفیہ کے نام لکھا ہے۔

ارکان جماعت کے نام گویا یہ ایک کھلا خط ہے، جس میں مخاطبین سے جا بجا خطاب صیغہ جمع حاضر میں ہے، سبب تالیف یہ بیان کیا ہے کہ صوفیۂ متقدمین دنیا سے رخصت ہو چکے، ان کے طور طریقے بھی ان کے ساتھ ناپید ہو گئے، اب بجائے ان کے، جو لوگ ہیں، او ران کی نیابت کے مدعی ہیں وہ عبادتوں کے تارک ہیں اور غفلتوں اور خواہشوں میں مبتلا،

اعلموا ان المحققين من هذه الطائفة انقرض اكثرهم ولم يبق في زماننا هذا من هذه الطائفة الا اثرهم حصلت الفترة في هذه الطريقة لا بل اندرست الطريقة بالحقيقة مضى الشيوخ الذين كانوا بهم اهتداء وقل الشباب الذين كان لهم بسيرهم وسنتهم اقتداء وزال الورع وطوى بساطه واشتد الطمع وقوى رباطه وارتحل عن القلوب حرمة الشريعة فعدوا قلة المبالاة بالدين اوثق ذريعة ورفضوا تمييز

اس طبقہ کے جو محققین تھے ان میں سے اکثر اٹھ گئے، اور ہمارے زمانہ میں ان لوگوں کی بس یاد ہی باقی رہ گئی، اصل طریقہ گویا مفقود ہی ہو گیا ہے، اور حقیقت کے میدان میں سناٹا چھا گیا ہے، نہ وہ بڑے باقی رہے جن کی راہ پر چلا جائے، اور نہ وہ جوان جن کی سیرت اختیار کی جائے، زہد و تقوی کی بساط ہی الٹ گئی اور حرص و طمع کا دور دورہ آ گیا، شریعت کا احترام تک دلوں سے مٹ گیا اور دین کی طرف سے بے پروائی اور آسان ہو گئی، احکام

بین الحلال والحرام ودانوا بترك الاحترام وطرح الاحتشام واستخفوا باداء العبادات واستهانوا بالصوم والصلوٰة وركضوا في ميدان الغفلات وركنوا الى اتباع الشهوات (صہ ۲و۳)

کی عظمت نہ رہی، اور عبادات، نماز روزہ کی بے وقعتی دلوں میں سما گئی اور غفلتوں اور شہوتوں کی طرف رجحان عام ہو گیا،

جب ان نام نہاد صوفیہ کی اخلاقی پستی حد سے گذر گئی، عبادت وطاعت میں انہماک کے بجائے ان سے استخفاف شروع ہو گیا، شریعت کی پیروی کی جگہ اسکی خلاف ورزی باعث فخر سمجھی جانے لگی، روح کے تزکیہ سے کوئی واسطہ نہ رہا، سر تا سر نفسانیت غالب آگئی اور ستم یہ کہ ان دنیاداریوں کے باوجود دعوی مشیخت و روحانیت کا قائم رہا، اور مخالفین کو حقیقت تصوف سے انکار اور منکرین کو مسلک حقیقت پر اعتراض کے موقعے کثرت سے ملنے لگے، تو ایسی حالت میں شیخ کو ضروری معلوم ہوا کہ جماعت کی خدمت میں ایسا رسالہ پیش کیا جائے، جس میں صوفیہ متقدمین کے صحیح حالات کا بیان اور ان کے اخلاق وعبادات، عقائد و معلومات وغیرہ کی تفصیل ہو،

فعلقت هذه الرسالة اليكم اكرمكم الله ذكرت فيها بعض سير شيوخ هذه الطريقة في آدابهم واخلاقهم ومعاملاتهم وعقائدهم بقلوبهم وما اشاروا اليه من

ان حالات میں میں نے یہ رسالہ آپ لوگوں کی خدمت میں لکھا ہے اسمیں میں نے شیوخ طریقت کی سیرتوں کا ذکر کیا ہے، جن سے انکے آداب اخلاق، معاملات وعقائد پر روشنی پڑے گی، اور ان کے وجد وحال اور

مواجیدهم وکیفیة ترقیهم
من هدایتهم الی نهایتهم لکی
تکون لمریدی هذه الطریقة قوة (ص۳)

ان کی کیفیات ترقی کی جانب
اشارے ہیں، تاکہ ان کے مطالعہ
طریقت کے طالبین و سالکین کو
قوت حاصل ہو۔

بنے ہوئے صوفیوں اور گڑھے ہوئے تصوف کا یہ نقشہ جب پانچویں ہی صدی ہجری کے شروع میں ہو گیا تھا، تو پھر آج کے "شاہ صاحبوں" کی مصوری کن لفظوں اور عبارتوں سے کی جائے۔

الرسالہ مصری چھپا ہوا چوڑی تقطیع اور باریک ٹائپ کے ۱۸۶ صفحوں پر آیا ہے،

ابتدا کے چند صفحات (ص۳-۷) اعتقاد هذه الطائفة فی مسائل الاصول پر ہیں اور ان میں اصول توحید و مسائل توحید میں قدمائے صوفیہ کے اقوال درج ہیں،

باب (۱)، کا عنوان فی ذکر مشائخ هذه الطریقة وما یدل من سیرهم واقوالهم علی تعظیم الشریعة ہے (ص۷-۲۱)

اس میں اسّی سے کچھ اوپر بزرگوں کا تذکرہ ہے، جن میں سے ہر ایک اپنے ملک اور زمانہ میں کامل اور مسلم صوفی ہوا ہے، مثلاً ابراہیم ادہم، فضیل عیاض، ذوالنون مصری، معروف کرخی، سہل تستری، سری سقطی، بایزید بسطامی، یحییٰ معاذ رازی، شفیق بلخی، جنید بغدادی، وغیرہم، اور ان کے اقوال اور اعمال دونوں سے یہ دکھایا ہے کہ شریعت کا کتنا اہم درجہ ان حضرات کی نظر میں تھا،

سب سے پہلے لفظ تصوف و تاریخ تصوف کا بیان چند لفظوں میں ہے،

ان المسلمین بعد رسول اللہ   رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ

صلی اللہ علیہ وسلم لم یتسم
افاضلھم فی عصرھم بتسمیۃ
علم سوی صحبۃ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اذلا فضیلۃ
فوقھا فقیل لھم الصحابۃ
ولما ادرکھم اھل العصر الثانی
سمی من صحب الصحابۃ التابعین
ورأوا ذلک اشرف سمۃ
ثم قیل لمن بعدھم اتباع
التابعین ثم اختلف الناس
وتباینت المراتب فقیل
لخواص الناس ممن لھم شدۃ
عنایۃ بامر الدین الزھاد
والعباد ثم ظھرت البدع
وحصل التداعی بین الفرق
فکل فریق ادعوا ان فیھم
زھادا فانفرد خواص اھل
السنۃ المراعون انفاسھم
مع اللہ تعالی الحافظون
قلوبھم عن طوارق الغفلۃ
باسم التصوف واشتھر ھذا

کے لئے مومن کے لئے کوئی لفظ صحابی
سے بڑھ کر پُرفخر اور افضل نہیں ہو سکتا
تھا، چنانچہ اس وقت کے افاضل
اسی لقب سے موسوم ہوئے، اسکے
بعد جب دوسری نسل چلی تو ان
صحابیوں کے صحابیوں کے لیئے تابعین
کی اصطلاح ہوئی، پھر ان کی بھی
آنکھیں دیکھنے والے تبع تابعین
کہلائے، اس کے بعد جب امت
زیادہ پھیلی اور لوگ طرح طرح کے
پیدا ہونے لگے تو جن لوگوں کو امر
دین میں زیادہ انہماک ہوا
انہیں زہاد و عباد کہا جانے لگا
لیکن جب بدعتوں کا ظہور ہوا اور
فرقہ فرقہ الگ ہو گئے تو ہر فرقہ اس
کا مدعی بن بیٹھا کہ زہاد و عباد اسی
میں ہیں، اس وقت اہل سنت کے
طبقۂ خاص نے جو ذکر الٰہی میں مشغول
اور غفلتوں سے دور رہتا تھا، اپنے
لیے "اہل تصوف" کی اصطلاح قائم
کی اور شہرت کو آج دو صدیاں پوری

الاسم لهولاء الاکابر قبل الثمانين من الهجرة (ص۔۔)

نہیں ہوئی تھیں کہ یہ لقب اس طبقہ خواص کے اکابر کے لیے مخصوص ہوگیا'

اس کے بعد اکابر طریقت کی حکایتیں اور اقوال نقل کئے ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ اُن حضرات کے نزدیک تصوف کیا چیز تھی، اور اب اس سے موجودہ گدی نشینوں کی رسوم پرستی کو کوئی علاقہ رہ گیا ہے۔

بشر حافی جس پایہ کے امام طریقت گذرے ہیں، سب کو معلوم ہے، ان کی بابت یہ واقعہ انہی کی زبانی درج ہے،

رایت النبی صلی الله علیه وسلم فی المنام فقال لی یا بشر تدری لم رفعك الله من بين اقرانك قلت لا یا رسول الله قال باتباعك بسنتی وخدمتك للصالحين ونصيحتك لاخوانك ومحبتك لاصحابی واهل بيتي هو الذی بلغك منازل الابرار (ص۱۱)

میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، ارشاد ہوا اے بشر تمکو معلوم ہے کہ اللہ نے تمھارے معاصرین میں سے تمھاری اتنی عزت افزائی کیوں کی؟ عرض کیا کہ نہیں معلوم، ارشاد ہوا کہ میری سنت کی پیروی، صالحین کی خدمت گزاری، اپنے بھائیوں کی خیر اندیشی اور میرے اصحاب اہل بیت کے ساتھ محبت کی بنا پر، بس یہی چیزیں ہیں جنھوں نے تجھے ابرار کے مرتبہ پر فائز کردیا،

بایزید بسطامی سے دریافت کیا گیا کہ آپ اس مرتبہ تک کیونکر پہنچے؟ بولے "بھوکے پیٹ اور ننگے بدن کے ذریعہ سے۔" انہی بایزید کو شورش و سرمستی کے باوجود اتباع سنت میں اس قدر انہماک تھا کہ خود فرماتے ہیں کہ ایک بار میں نے اللہ سے

دعا کرنی چاہی کہ میرے لئے کھانے کی خواہش اور عورت کی خواہش کو مردہ کردے معاً یہ خیال آگیا کہ جس شے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے نہیں کیا، میں اسے کیونکر طلب کروں، اور اس دعا سے باز رہا، اس احترام سنت نبوی کا صلہ یہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے از خود خواہش فساد کو میرے لئے اس قدر مردہ کر دیا کہ میرے نزدیک دیوار اور عورت برابر ہیں، (صہ ۱۴)

حاتم اصمؒ فرماتے ہیں کہ صبح شیطان مجھ سے سوال کرتا ہے کہ تیرا کھانا کیا ہے، لباس کیا ہے، اور سکونت کہاں ہے؟ میں جواب دیتا ہوں کہ میری غذا موت ہے، میرا لباس کفن ہے اور میرا مسکن قبر ہے، انہی بزرگ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کو خواہشات نہیں پیدا ہوتیں؟ جواب دیا کہ میری سب سے بڑی خواہش یہ رہتی ہے کہ رات ہونے تک دن خیریت سے گذر جائے، لوگوں نے کہا کہ دن تو خیریت سے گذرتے ہی رہتے ہیں، ارشاد ہوا کہ میں خیریت اسے کہتا ہوں کہ اس روز معاصی الٰہی کا ارتکاب نہ ہو (صہ ۱۶)

شیخ ابوالحسن احمد دارامیؒ سے منقول ہے کہ اتباع سنت نبوی سے باہر ہو کر کوئی سا بھی عمل کیا جائے باطل ہوگا، (صہ ۱۷)

جنید بغدادیؒ سید الطائفہ کہلاتے ہیں، ان کے اقوالِ ذیل آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں:-

"ہم نے تصوف کو قیل و قال کے ذریعہ سے حاصل نہیں کیا ہے، بلکہ گرسنگی ترک دنیا اور ترک مرغوبات و مالوفات سے حاصل کیا ہے،

"خلق پر تمام راستے بند کر دیئے گئے ہیں، بجز اس کے کہ سنت نبوی کے نقش قدم پر چلا جائے۔"

"ہمارا سارا طریقہ کتاب اللہ و سنت رسول کا پابند ہے"

"جو شخص کلام الٰہی کا حافظ اور احادیث رسول کا عالم نہیں اس کی تقلید تصوف کے باب میں درست نہیں، اس لئے کہ ہمارے اس سارے علم (سلوک) کا ماخذ قرآن و حدیث ہیں۔" (۱۹)

شیخ داؤد رقی کا قول تھا کہ دنیا میں سب سے کمزور شخص وہ ہے جو اپنی خواہشوں کے ضبط پر قدرت نہ رکھتا ہو، اور سب سے زیادہ طاقتور وہ ہے، جو اس پر قدرت رکھتا ہو، اور اللہ سے محبت رکھنے کی علامت یہ ہے کہ اس کی طاعتوں کو اختیار کیا جائے، اور اس کے رسول کی راہ پر چلا جائے، (ص ۲۵)

غرض اسی طرح باب میں جتنی حکایات اور اقوال نقل کیے ہیں، ان کا حاصل صرف یہ چند چیزیں ہیں: تعظیم شریعت، علم قرآن و حدیث، اتباع سنت نبوی، ترک لذات، قطع علائق، لزوم عبادات و مجاہدات،

باب (۲) کا عنوان ہے، فی تفسیر الفاظ تدور بین ھذہ الطائفۃ وبیان ما اشکل منہا، (ص ۲۱-۲۵)

اس میں مصطلحات تصوف کی توضیح و تشریح ہے، مثلاً وقت، مقام، حال، قبض، بسط، ہیبت، انس، تواجد، وجد، وجود، جمع، فرق، فنا، بقا، غیبت، حضور، صحو، سکر وغیرہا،

محو و اثبات دو ایک تعریفوں کے نمونے ملاحظہ ہوں:۔

المحو رفع اوصاف العادۃ والاثبات اقامۃ احکام العبادۃ فمن نفی عن احوالہ الخصال الذمیمۃ و اُتی بدلہا بالافعال والاحوال	محو نام ہے صفات عادی کے ادا ہو جانے کا اور اثبات نام ہو احکام عبادت کے قائم ہو جانے کا جس نے اپنے احوال سے صفات بد کو دور کر دیا اور انکے بجائے افعال و احوال

الحیدۃ فھو صاحب محو و اثبات (ص۳۹)

تمیز پر قائم ہو گیا وہ صاحب محو و اثبات ہے،

تلوین و تمکین التلوین صفۃ ارباب الاحوال والتمکین صفۃ اھل الحقائق فما دام العبد فی الطریق فھو صاحب تلوین لانہ یرتقی من حال الی حال وینتقل من وصف الی وصف ویخرج من مرحل ویحصل فی مربع فاذا وصل تمکن (ص۴۱)

تلوین اہل حال کی صفت ہے اور تمکین اہل حقیقت کی، بندہ جب تک اثنائے راہ میں ہے، برابر ایک حال سے دوسرے حال میں ترقی اور ایک وصف سے دوسرے وصف کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے اور اس لئے صاحب تلوین کہلاتا ہے، پھر جب راہ سے نکل کر منزل وصف تک پہنچ جاتا ہے تو اسے تمکین حاصل ہو جاتی ہے۔

شریعت و حقیقت الشریعۃ امر بالتزام العبودیۃ والحقیقۃ مشاھدۃ الربوبیۃ فکل شریعۃ غیر مؤیدۃ بالحقیقۃ فغیر مقبول وکل حقیقۃ غیر مقیدۃ بالشریعۃ فغیر محصول، (ص۴۳)

شریعت نام ہے، التزام حکم عبودیت کا، اور حقیقت نام ہے مشاہدہ ربوبیت کا پس جس شریعت کو حقیقت کی تائید حاصل نہ ہو وہ غیر مقبول ہے، اور جو حقیقت شریعت کی پابند نہیں وہ لاحاصل ہے،

اس کے بعد احوال، مقامات و مسائل تصوف سے متعلق جتنے اہم عنوانات ہو سکتے ہیں، سب پر الگ الگ ایک باب باندھا ہے، اور اس پر قرآن مجید احادیث رسول، اور اقوال اکابر سلف کی روشنی میں گفتگو کی ہے، ان بابوں کی تعداد پچاس ہے۔ (ص۴۵-۲۰۵)

چند عنوانات ملاحظہ ہوں:۔

باب التوبۃ، باب المجاھدۃ، باب الحزن، باب الجوع وترک الشھوۃ باب مخالفۃ النفس، باب الحسد، باب القناعۃ، باب الذکر، باب الجود والسخا، باب الغیرۃ، باب الصحبۃ، باب السماع،

یہ تمام باب، اختصار کے باوجود جامعیت کا وصف رکھتے ہیں، ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اکثر کا آغاز قرآن مجید ہی کی کسی آیت سے ہوتا ہے، اور یہ گویا ایک عملی دلیل ہے، مصنف کے اس دعویٰ کی، کہ سلوک کا اصل ماخذ قرآن مجید ہے چند ابواب کی افتتاحی آیتیں ملاحظہ ہوں،

باب الحزن - قال اللہ عزوجل وقال الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن،
باب التقوی - قال اللہ تعالیٰ، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم،
باب الیقین - قال اللہ تعالیٰ، والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالآخرۃ ھم یوقنون

باب الصبر - قال اللہ تعالیٰ، واصبر وما صبرک الا باللہ،
باب الفتوہ - قال اللہ تعالیٰ، انھم فتیۃ آمنوا بربھم وزدناھم ھدی
باب الحیاء - قال اللہ تعالیٰ، الم یعلم بان اللہ یری،

ان عنوانی آیتوں سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ شیخ کو قرآن مجید سے استنباط نکات میں ملکہ حاصل تھا، آیات قرآنی کے بعد احادیث نبوی کو رکھا ہے، اور جس باب سے متعلق کوئی صریح وواضح آیت قرآنی نہ مل سکی، اُسے حدیث سے شروع کیا ہے، اور یوں عملاً بھی ظاہر کر دیا، کہ تصوف اسلامی کے ماخذوں میں قرآن مجید کے بعد دوسرا درجہ حدیث رسول کا ہے،

کتاب کا باب (۵۱) باب السماع پر ختم ہو جاتا ہے،

باب (۵۲) اثبات کرامات الاولیاء پر ہے، (صـ ۱۵۸-۱۷۵)

یہ باب متعدد فصلوں میں تقسیم ہے، اور ان میں کرامت کے امکان وقوع، شرائط وقوع وغیرہ پر گفتگو ہے۔

باب (۵۳) کا عنوان باب رویا النوم ہے (صفحہ ۱۷۵-۱۸۰)

اس میں آیت نوم، رویائے صالحہ، پریشان خوابی اور مسائل متعلقہ پر تفصیلی بحث ہے،

باب (۵۴) باب وصیۃ للمریدین ہے (صفحہ ۱۸۰-۱۸۶)

کتاب کا سب سے بڑھ کر قابل غور باب یہی ہے، اور اس لحاظ سے سب سے زیادہ اہم بھی، کہ سابق کے ابواب میں تو عموماً اقوال وحکایات کی نقل کی گئی ہے لیکن اس باب میں شیخ نے اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر مریدین وطالبین کے لئے کچھ ہدایتیں اور نصیحتیں تحریر کی ہیں، اس باب کو کتاب کا خلاصہ یا نچوڑ اور مکتب تصوف کا دستور العمل سمجھنا چاہیئے۔

یہ باب چھوٹی چھوٹی فصلوں میں تقسیم ہے، اور ہر فصل میں کسی اہم حقیقت یا نصیحت کو مختصر لفظوں میں قلمبند کر دیا ہے، چند ملاحظہ ہوں،

(الف) وبناء هذا الامر وملاكه على حفظ آداب الشريعة وصون اليد عن المد الى الحرام والشبهة وحفظ الحواس عن المحظورات وعد الانفاس مع الله تعالى من الغفلات (صفحہ ۱۸۱)

تصوف کی ساری بنیاد اسی پر ہے کہ آداب شریعت کی پابندی رہے، حرام اور مشتبہ چیزوں سے دست کشی کی جائے، ناجائز اوہام وخیالات سے حواس کو آلودہ نہ کیا جائے اور غفلتوں سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں وقت گذاری کی جائے،

(ب) ومن شان المريد دوام

مرید کو ترک شہوات کے مجاہدہ

المجاہدۃ فی ترک الشہوات فان من وافق شہوتہ عدم صفوتہ واقبح الخصال بالمرید رجوعہ الی شہوۃ ترکہا للہ تعالیٰ، (ص۱۸۵)

مدام مشغول رہنا چاہیئے، خواہشوں کی پابندی اور روح کی پاکیزگی کا ساتھ نہیں ہو سکتا اور مرید کے لیئے یہ بدترین پستی ہے کہ جس خواہش کو اللہ کے لئے چھوڑ چکا، اسکی جانب پھر رجوع کرے،

(ج) ومن شان المرید حفظ عہودہ مع اللہ تعالیٰ فان نقض العہد فی طریق الارادۃ کالردۃ عن الدین لاہل الظاہر (ص۱۸۵)

طالب کو اسکی بڑی احتیاط چاہیئے کہ ایکمرتبہ جس بات کا عہد خداوند تعالیٰ سے کر لیا، اسے نہ توڑے، طریقت میں نقض عہد کا وہی درجہ ہے جو شریعت ظاہری میں ارتداد کا ہے۔

(د) ومن شان المرید قصر الامل فان الفقیر ابن وقتہ فاذا کان لہ تدبیر فی المستقبل و تطلع لغیر ما ہو فیہ من الوقت واملٍ فیما یستانفہ لا یجیٔ منہ شیٔ (ص۱۸۶)

طالب کو چاہیئے کہ دامانِ آرزو کو بہت نہ پھیلائے، فقیر کو صرف حال سے سروکار رکھنا چاہیئے مستقبل کے خیالی پلاؤ پکاتے رہنا اس کی شان نہیں،

(ہ) ولا ینبغی للمرید ان یعتقد فی المشایخ العصمۃ بل الواجب ان یذرہم واحوالہم فیحسن بہم الظن (ص۲۰۳)

مرید کو یہ نہ چاہیئے کہ اپنے مشایخ کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھے، البتہ ان سے حسنِ ظن رکھنا واجب ہے،

(و) ومن شان المرید التباعد من

اہل دنیا کی صحبت سے طالب کو ہر طرح

ابناء الدنیا فان صحبتہم سم	بچنا چاہیئے اور اسے اپنے حق میں زہر
مجرب لا لہم ینتفعون بہ وھو	سمجھنا چاہیئے (زاہد تقرب الٰہی
ینتقص بہم وان الزھاد یخرجون	کے لئے مال کو اپنے پاس سے دور کرتے
المال عن الکیس تقربا الی اللہ	رہتے ہیں اور صوفی تحقق الٰہی کی غرض
تعالیٰ واھل الصفاء یخرجون	سے خلائق سے اپنے قلب کو خالی کرتے
الخلق والمعارف من القلب	رہتے ہیں۔
تحققا باللہ تعالیٰ (ص ۱۸۶)	

(ز) خوش گلو لڑکوں اور امردوں سے دوستی آج کل کی نہیں، اس زمانہ کا یہ مرض ہے اجازت کرنے والوں کو نفس نے عجب عجب تاویلیں سمجھا دی ہیں، شیخ کی تحقیق میں، اصعب الآفات فی ھذہ الطریقۃ یہ سخت ترین خطرہ راہ ہے شیخ اس پر بہت زور سے متنبہ کرتے ہیں اور ڈراتے ہیں کہ بالفرض سالک رتبہ شہداء تک پہونچ گیا ہو، تو اس عمل کی بے برکتی سے سب کچھ چھن جاتا ہے، اور اس کی پوری طرح رسوائی ہو کر رہتی ہے، ذیل میں ان کے بیان کی صرف ذرا ابتدائی عبارت بلا ترجمہ درج کی جاتی ہیں،

ومن اصعب الآفات فی ھذہ الطریقۃ صحبۃ الاحداث ومن ابتلاہ اللہ تعالیٰ بشئی من ذالک فباجماع الشیوخ ذلک عبد اھانہ اللہ عز وجل وخذلہ بل عن نفسہ شغلہ ولو بالف الف کرامۃ اھلہ وھب انہ بلغ رتبۃ الشہداء (ص ۱۸۶)

کتاب کے سارے مطالب کا لب لباب نظر کے سامنے آگیا، رواجی اور مروجہ تصوف کے لئے سند جواز کوئی ہلکی میں بھی ہلکی ہاتھ آئی ؟

(۴) فتوح الغیب[1]

(شیخ عبدالقادر محی الدین جیلانیؒ)

(۱) مصنف

اگر یہ سوال کیا جائے کہ صوفیۂ کرام کے سارے سلسلوں میں شہرت عام اور مقبولیت انام سب سے زیادہ کس کے حصہ میں آئی ہے؟ تو عجب نہیں کہ متفقہ طور پر نام حضرت شیخ جیلانیؒ ہی کا زبانوں پر آ کر رہے، دوسرے بزرگوں کے تعلقے پھر محدود ہیں، شیخ جیلانی کا نام خواص اور عوام سب کی زبان پر ہے، مختلف ناموں اور تعظیمی لقبوں کے ساتھ "غوث اعظم" "محبوب سبحانی" وغیرہ متعدد چلتے ہوئے نام اور لقب ہیں، آپ کا زمانہ قدماء صوفیہ کا آخر زمانہ تھا، اس لئے بھی آپ کے ارشادات اور زیادہ توجہ کے مستحق ہیں،

اسم مبارک عبدالقادر تھا، کنیت ابو محمد، محی الدین لقب قرار پایا، متاخرین نے فرط عقیدت سے متعدد القاب کا اضافہ کر دیا،

سیادت نسبی دونوں طرف سے حاصل تھی، والد ماجد کی طرف سے سلسلۂ نسب

---

[1] ماخذ، (۱) نشر المحاسن الغالیہ فی فضل مشائخ الصوفیہ - از عبداللہ یافعی (قلمی) (۲) قلائد الجواہر فی مناقب شیخ عبدالقادر، از محمد بن یحییٰ الحلبی (۳) طبقات الکبریٰ از شیخ عبدالوہاب شعرانی (۴) اخبار الاخیار از شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۵) نفحات الانس از ملا جامی (۶) سفینۃ الاولیاء از داراشکوہ (۷) انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، مقالہ عبدالقادر (قدیم و جدید ایڈیشن)

سیدنا حضرت حسن رضؓ تک پہونچتا ہے، اور والدۂ ماجدہ کی طرف سے سیدنا حضرت حسین رضؓ تک، اسی لئے نام کے ساتھ حسنی و حسینی لکھا جاتا ہے، سایۂ پدری بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا،

ولادت باختلاف روایت ۴۷۰ھ یا ۴۷۱ھ میں ہوئی، مولد نواح طبرستان میں قصبہ گیلان ہے اسی کو عربی میں جیلان کہتے ہیں، سال وفات میں کوئی اختلاف نہیں یہ ۵۶۱ھ ہے، عمر شریف ۹۰ سال کی ہوئی، ماہ ربیع الثانی بھی سب کو مسلم ہے، البتہ تاریخ میں اختلاف ہے ۸ ربیع الثانی، ۱۰ ربیع الثانی، ۱۱ ربیع الثانی، ۱۴ ربیع الثانی، ۱۷ ربیع الثانی سب نقل ہوئی ہیں، داراشکوہ نے ان سب کو چھوڑ کر ۹ ربیع الثانی کو اختیار کیا ہے، ۱۸ سال کی عمر میں بغداد آگئے، عمر کا بیشتر حصہ یہیں گذرا، یہیں وفات پائی، یہیں مدفون ہوئے۔

سلسلۂ تعلیم کی ابتداء قرآن مجید سے ہوئی، حفظ کیا، پھر ادب و فقہ و حدیث کی تحصیل اور باضابطہ تکمیل اپنے زمانہ کے کامل استادوں اور ماہرین فن سے کی۔ نظر کی وسعت اور علم کے تبحر کی گواہ خود آپ کی دونوں کتابیں غنیۃ الطالبین اور فتوح الغیب ہیں، فقہ میں مسلک احمد بن حنبل پر تھے، تدریس، فتویٰ نویسی اور وعظ گوئی کے مشغلے سالہا سال جاری رہے، ایک بڑے گروہ نے علوم ظاہری میں شاگردی کی۔ استفتے دور دور سے آتے، آپ برجستہ جواب تحریر کرا دیتے،

طریق باطنی کی تعلیم شیخ حماد، قاضی ابوسعید مبارک مخزومیؒ اور شیخ ابو یوسف یعقوب ہمدانی سے پائی، شیخ خرقہ قاضی ابوسعید مخزومی تھے، شیخ صحبت شیخ حماد رہے، نسبت ارادت براہ راست سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اور اہل تذکرہ کا بیان ہے کہ انوار و فیوض کا نزول اسی سرکار سے ہوتا تھا۔ تذکروں میں کرامت اور خرق عادت کے واقعات اس کثرت سے مذکور ہیں کہ شاید ہی کسی دوسرے بزرگ کے ہوں، امام یافعیؒ کہتے ہیں کہ شیخ کی کرامتوں کی تعداد حد شمار

سے خارج ہے، اور اکثر بحسب اصطلاح صوفیہ نہ کہ محدثین تواتر یا قریباً تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں
داراشکوہ کے الفاظ، بہت کچھ لکھنے کے باوجود یہ ہیں،

اگر آنچہ از آنحضرت در ایام حیات	حضرت سے جو واقعات زندگی میں صدور
بہ ظہور رسیدہ و آنچہ الحال نیز	میں آتے رہے، اور جو آج بھی مشاہدہ
مشاہدہ نمودہ می شود می گفتم کتاب	میں آرہے ہیں، ان سب کو جمع کیا
کلانے می شود،	جائے تو کتاب ضخیم ہوجائے۔

شیخ عبدالحق دہلوی، حضرت کے ایک معاصر بزرگ شیخ علی ہیتی کی شہادت نقل کرتے ہیں کہ :-

ندیدم ہیچ یکے از اہل زمان خود	انھوں نے اپنے زمانہ میں کسی کو شیخ عبدالقادر
اکثر الکرامات از شیخ عبدالقادر	سے بڑھ کر صاحب کرامات نہیں پایا جس
ہر وقت ہر کہ از ما خواہد کرامتے از وے	وقت جو ان سے کرامت کا مشاہدہ
کرامتے مشاہدہ کند می کند	کرنا چاہے، کر لیتا ہے، خرق عادت
خوارق ظاہر گردد، گاہے از وے	کبھی خود انہی سے ظاہر ہوتی ہے، کبھی
گاہے در وے گاہے بوے،	ان کے متعلق اور کبھی ان کے ذریعے

آپ کی والدہ ماجدہ ایک ایسی کرامت کا ذکر کرتی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ولایت مادر زاد تھی، فرماتی ہیں، کہ شروع ہی سے احکام شریعت کا یہ التزام تھا کہ رمضان بھر دن میں دودھ نہیں پیتے تھے، اتفاق سے ۲۹ شعبان کو ابر تھا، چاند دکھائی نہ دیا، دوسرے دن اس بچہ نے دودھ نہ پیا، آخر تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ چاند ہوگیا تھا، اور اُس دن یکم رمضان تھی،

ایک دوسری روایت ہے کہ بچپن کا زمانہ تھا، آبادی کے باہر کھیل رہے تھے، کہ ایک گائے کی دُم پکڑ کر کھینچی، وہ قدرت حق سے گویا ہوگئی، اور پلٹ کر اس نے

کہا" اے عبدالقادر تم دنیا میں، اس غرض سے نہیں بھیجے گئے ہو" معاً اسے چھوڑ دیا، دل پر ہیبت طاری ہوئی، مکان آکر بالاخانہ سے جو نظر کی تو دیکھا کہ سامنے میدان عرفات ہے، اور حاجیوں کی قطاریں، والدۂ ماجدہ سے آکر عرض کی کہ راہ خدا طے کرنے کی اجازت دیجئے، بغداد جاکر تحصیل علم کروں، انھوں نے سبب پوچھا کل واقعہ ان سے بیان کیا ان نیک دل خاتون پر رقت طاری ہوگئی، اُٹھ کر گئیں، ایک تھیلی لاکر فرزند نامدار کے ہاتھ میں دیدی، اور فرمایا کہ" بیٹا تمھارے والد مرحوم کل اسّی دینار چھوڑ گئے تھے چالیس کی امانت تمھارے بھائی کے لئے محفوظ ہے، یہ چالیس تمھارے حوالہ، میری نصیحت وصیت، جو کچھ بھی ہے بس اتنی ہے، کہ راستی کو کسی حالت میں نہ چھوڑنا، جاؤ تمھیں اللہ کو سونپا، اب قیامت کے دن دیکھنے کو ملو گے"

راستہ میں ڈاکوؤں نے قافلہ پر حملہ کیا، ہر شخص مال چھپانے، جان بچانے کی فکر میں ہوا، اس سعادت مند فرزند اور اللہ کے برگزیدہ بندہ نے صاف صاف اپنے پاس کی مالیت کو بیان کر دیا، قزاق راست بازی اور دیانت کی اس کرامت پر دنگ رہ گئے، آخر اپنے پیشہ سے تائب ہو کر رہے۔

منزل صدق میں شاید اسی قیام و استقامت کا یہ نتیجہ نکلا کہ آگے چل کر وہ مرتبۂ اعظم حاصل ہوا، جو مقام صدیقیت کے لئے مخصوص ہے، اور رہرودں کے لئے تو کیا، اچھے اچھے رہبروں اور رہنماؤں تک کے لئے باعث رشک، فرماتے تھے، کہ جب تک ہنسنے کا حکم نہیں ملتا، نہیں ہنستا ہوں، جب تک کھانے کا حکم نہیں ملتا، نہیں کھاتا ہوں، جب تک بولنے کا حکم نہیں ملتا نہیں بولتا ہوں،

تصانیف متعدد چھوڑیں، مندرجۂ ذیل یا تو خود موجود ہیں یا انکے نام دوسری کتابوں میں محفوظ ہیں،

(۱) غنیۃ الطالبین فقہ حنبلی کی مشہور کتاب

(۲) فتوح الغیب — فن سلوک پر

(۳) الفتح الربانی — مجموعۂ مواعظ

(۴) جلاء الخاطر

(۵) الیواقیت والحکم

(۶) الفیوضات الربانیہ

(۷) حزب بشائر الخیرات

(۸) المواہب الرحمانیہ

یہ سب نام مارگولیتھ نے انسائیکلوپیڈیا (قدیم ایڈیشن) آف اسلام میں مقالۂ "عبد القادر محی الدین جیلانی" کے تحت میں درج کئے ہیں،

مارگولیتھ ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ سب کتابیں شیخ کے فضل و کمال تفقہ فی الدین اور تبحر علمی کی زبردست گواہ ہیں،

بادشاہوں سے یہ ہدیہ نہیں قبول فرماتے تھے، ان کے علاوہ اگر کوئی شخص تحفہ لے آتا تو قبول فرمالیتے، اور اسی وقت حاضرین میں تقسیم فرمادیتے، ایک روز خلیفۂ وقت المستنجد باللہ نے حاضر ہو کر اشرفیوں کے دس توڑے پیش کئے، حسب معمول انکار فرمایا، ادھر سے اصرار بڑھا، شیخ نے ایک توڑا اپنے داہنے ہاتھ اور دوسرا بائیں ہاتھ سے اٹھا کر دونوں کو رگڑا، تو اشرفیوں سے خون بہنے لگا، خلیفہ سے ارشاد ہوا کہ "اللہ سے شرم نہیں آتی کہ انسان کا خون کھاتے ہو، اور اسے جمع کر کے میرے پاس لاتے ہو" راوی کا بیان ہے کہ خلیفہ پر اتنا اثر پڑا کہ غشی کی نوبت آگئی،

خلیفۂ وقت یا کسی صاحب ثروت کے ہاں جانے کی عادت نہ تھی، اور نہ امراء کی تعظیم فرماتے، اگر خلیفہ کی آمد سنتے تو اٹھ کر مکان کے اندر تشریف لے جاتے اور پھر باہر نکل آتے، تاکہ خلیفہ کی تعظیم کے لئے اٹھنے کا سوال ہی نہ پیدا ہو، تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ جب خلیفہ کے نام نامہ مبارک کی ضرورت پیش آتی، تو یوں تحریر فرمایا جاتا، کہ "عبد القادر کا تجھ سے ارشاد ہے، اور اس کا ارشاد دیتا ہے اور نافذ ہے" خلیفہ ان تحریروں کو سر اور آنکھوں پر جگہ دیتا،

صحیفہ زندگی کی ہر سطر احکام شریعت کے مطابق و ماتحت تھی، وعظ بیان فرماتے تھے تو قرآن مجید ہی سے، مکتوب تحریر فرماتے تو بھی اسی سرچشمہ انوار و ہدایت سے، تعلیمات میں سب سے زیادہ زور پابندی شریعت اور پیروی سنت پر ہوتا، وفات پر ذرا پیشتر مشائخ عصر کا مجمع تھا، بڑے صاحبزادے سیف الدین عبدالوہاب نے عرض کی، کہ حضرت کچھ وصیت فرمائیے، ارشاد ہوا،

علیکم بتقوی اللہ وطاعتہ ولا تخف احداً ولا ترج و وکل الحوائج الی اللہ واطلبها منہ ولا تثق باحد سوی اللہ خذ التوحید التوحید التوحید اجماع الکل	اللہ کے تقویٰ اور اطاعت کو اپنے اوپر لازم رکھو، بجز اللہ کے کسی سے نہ خوف رکھو نہ امید، تمام حاجتیں بس اللہ ہی کے سپرد کر دو اور اسی سے طلب کرتے رہو، اور بجز اللہ کے کسی پر اعتماد نہ رکھو، اپنے اوپر لازم کر لو توحید کو، توحید کو، توحید کو کہ اس پر سب کا اجماع ہے،

عبادتوں اور ریاضتوں کی کثرت کا اندازہ اس قسم کی روایتوں سے ہو سکتا ہے کہ چالیس سال تک عشاء کے وضو سے نماز فجر ادا کی، پندرہ سال تک یہ معمول رہا کہ بعد عشاء پورا کلام مجید ختم فرماتے تھے، پچیس سال تک صحراؤں میں اس تنہائی سے بسر کی کہ انسان کی شکل بھی نہیں دیکھی،

سالہا سال کی عبادتوں، ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد خود بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار مجھے بہت بڑا نور نظر آیا جو دیکھتے دیکھتے سارے افق پر چھا گیا۔ اس میں سے آواز آئی "اے عبدالقادر میں تیرا پروردگار ہوں، میں نے حرام چیزوں کو تیرے لئے حلال کر دیا" میں نے لاحول ولا قوۃ پڑھ کر کہا دور ہو ملعون، بس وہ نور تاریکی میں تبدیل ہو گیا اور

اُس میں سے آواز آئی "عبدالقادر، تو اپنے علم کی قوت سے مجھ سے بچ گیا، ورنہ میں تجھ جیسے ستر کاملوں کو گمراہ کر چکا ہوں۔" میں نے کہا ملعون تو اب بھی مجھے گمراہ کرنے میں لگا ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ تم اپنے علم کی قوت سے بچ گئے، حالانکہ مجھے بچانے والی میری کوئی بھی قوت نہیں، محض اللہ کا فضل و کرم ہے۔"

ذوق عبادت اور غلبۂ خشوع و تواضع کا اندازہ گلستان سعدی کی حکایت ذیل سے ہو گا۔

عبدالقادر گیلانی را دیدند رحمۃ اللہ	عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو
علیہ در حرم کعبہ روے بر حصا نہادہ	لوگوں نے دیکھا، آپ حرم شریف
بود و می گفت اے خداوند	میں سنگریزوں پر منہ رکھے ہوئے عرض
بنجشاے و اگر مستوجب عقوبتم	کر رہے تھے کہ اے خداوند مجھے بخش
مرا بروز قیامت نابینا بر انگیز	دے، اور اگر میں لائق عذاب سمجھا
تا در روے نیکاں شرمسار نباشم	جاؤں تو قیامت کے دن مجھے نابینا
(باب ۲ حکایت ۳)	اٹھانا تاکہ تیرے نیک بندوں کے
	سامنے شرمندہ نہ ہوں،

یہ خیال رہے کہ صاحب گلستاں شیخ سعدیؒ کا زمانہ حضرت جیلانیؒ سے کچھ ہی بعد کا تھا، اور شیخ حضرت گیلانیؒ کے ایک واسطے سے مرید بھی تھے، یعنی شیخ حضرت شہاب الدینؒ سہروردی کے مرید تھے، اور حضرت سہروردیؒ حضرت گیلانیؒ کے خلیفہ تھے۔ آپ کی عبدیت و عبودیت کا قدر شناس شیخ سعدی سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا۔

(ب) تصنیف

فتوح الغیب آج سے تین ساڑھے تین سو سال سے اُدھر دنیا کے لئے خود پردہ غیب میں تھی، شیخ سیف الدین عبدالحق محدث دہلوی (المتوفی ۱۰۵۱ھ) جب

فریضۂ حج ادا کرنے گئے تو مکہ معظمہ میں ایک نسخہ اس کتاب کا انھیں شیخ عبدالوہاب المتقی قادری کے ہاں ان کی نظر سے گذرا، ہندوستان واپس آئے تو ایک دوسرا نسخہ بھی انھیں مل گیا، فتوح الغیب عربی میں تھی، شیخ نے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا، کہ وہی اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان تھی، اور مفتاح الفتوح کے نام سے شرح بھی لکھی، فتوح الغیب کا موجودہ مطبوعہ نسخہ شیخ ہی کے ترتیب اور تہذیب دئے ہوئے نسخہ کی نقل ہے، لکھنؤ اور لاہور سے ان کی شرح کے ساتھ شائع ہوئی ہے،

کتاب حمد و نعت کے بعد اٹھتر مختصر مقالوں میں تقسیم ہے۔ آخر میں چند ورق مصنف کے حالات، مرض، وفات وغیرہ سے متعلق مرتب نے اضافہ کئے ہیں،

(۱) مقالہ اول (ص ۹-۱۰) تعمیل اوامر، اجتناب نواہی و رضا بالقضاء پر ہے، فرماتے ہیں،

لا بد لکل مومن فی سائر احوالہ من ثلثۃ اشیاء امر یمتثلہ ونھی یجتنبہ وقدر یرضی بہ فاقل حالۃ لا یخلو المومن فیھا من احد ھذہ الاشیاء الثلثۃ،	ہر مومن کے لئے ہر حال میں یہ تین چیزیں لازمی ہیں، ایک یہ کہ حکم الٰہی کی تعمیل کرے، دوسرے یہ کہ ممنوع سے بچتا رہے، تیسرے یہ کہ قضائے الٰہی پر راضی رہے۔ پس مومن کے لئے کم سے کم مرتبہ یہ ہے کہ ان تینوں چیزوں سے خالی نہ ہو،

(۲) مقالۂ دوم (ص ۱۰-۱۱) اتباع سنت و ترک بدعت پر ہے، آغاز کلام یوں کرتے ہیں:۔

اتبعوا ولا تبتدعوا واطیعوا ولا تفرقوا ووحدوا ولا	پیروی (سنت) کرتے رہو اور راہ بدعت نہ اختیار کرو، اطاعت کرو،

تشرکوا ویفعل اللہ ما یشاء ویحکم ما یرید ونزھوا الحق ولا تتھموا وصدقوا ولا تشکوا واصبروا ولا تجزعوا واجتمعوا علی الطاعۃ ولا تتفرقوا،

اور دائرۂ طاعت سے باہر نہ ہو، توحید خداوندی کو مانو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، کہ وہی جو کچھ چاہتا ہے اپنی مشیت سے کرتا ہے، اس کو ہر عیب سے پاک سمجھو اور اس پر تہمت نہ لگاؤ، اور تصدیق (اسلام) کرو اور شک میں نہ پڑو، صبر سے کام لو اور بے صبری نہ کرو، طاعت حق پر جمے رہو، اور جماعت میں تفرقہ نہ ڈالو،

آگے چل کر اس مقالہ میں یہ تعلیم ہے کہ گناہوں سے توبہ کرنے اور غفلت کے دور کرنے میں تاخیر نہ کرو، اور شب و روز استغفار تقصیر اور رجوع الی اللہ کرنے کو اپنے اوپر بار نہ سمجھو،

(۳) مقالۂ سوم (صفحہ ۱۲-۱۴) اس بحث سے متعلق ہے کہ ابتلاء و مصیبت سے بندہ کے لئے مقصود کیا ہوتا ہے،

اس میں بڑی خوبی اور صحت کے ساتھ سالک کی نفسیت کی تشریح کی ہے فرماتے ہیں کہ جب انسان پر کسی قسم کا دکھ درد وارد ہوتا ہے، تو سب سے پیشتر تو وہ اپنی ذاتی قوت و تدبیر سے اس کے دفع کرنے کی کوشش کرتا ہے، جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو خلق کی جانب رجوع کرتا ہے، مثلاً سلاطین، امراء، اہل ثروت وغیرہ سے، یا اگر بیمار ہو تو اطباء کی جانب رجوع کرتا ہے، جب اس میں بھی ناکام ہو چکتا ہے تو پروردگار عالم کی درگاہ میں دعا و تضرع کے ذریعہ سے حاضر ہوتا ہے، انسان کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی

ہے کہ جب تک وہ خود دفع مضرت پر قادر ہے، خلق سے بے نیاز رہتا ہے، جب اپنے تئیں مجبور پاتا ہے، تو خلق کے سامنے دست اعانت دراز کرتا ہے، جب ادھر سے بھی سہارا نہیں رہتا تو خالق کے آستانہ پر جبین نیاز رگڑتا ہے، اور نہایت خشوع و خضوع، الحاح و زاری کے ساتھ کبھی امیدوارانہ، کبھی مایوسانہ دعا میں مشغول ہو جاتا ہے، جب مشیت الٰہی اس کو اس میں بھی ناکام رکھتی ہے، اور اس کی دعا قبول نہیں ہوتی تو رفتہ رفتہ اس کی نظر میں تمام اسباب بے حقیقت ہو جاتے ہیں، اور اسے انقطاع الی اللہ حاصل ہو جاتا ہے اس وقت بندہ تمام تعلقات سے آزاد، روح مجردرہ جاتا ہے، اور اوصاف بشریت ہوا و ہوس خواہش، آرزو وغیرہ اس سے رخصت ہو جاتے ہیں، اس وقت اسے اتنی صفائی باطن اور نورانیت قلب حاصل ہو جاتی ہے کہ اسے ہر فعل کی فاعل ذات خالق ہی نظر آنے لگتی ہے، اور یہ یقین شہودی حاصل ہو جاتا ہے کہ تمام موجودات میں فاعل حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور ہر راحت و سکون، ہر خیر و شر، ہر سود و زیاں، ہر عطا و بخل، ہر کشائش و بندش، ہر موت و حیات، ہر عزت و ذلت، ہر تونگری و افلاس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں، کہ وہ قادر مطلق ہی کی قدرت کا ایک ظہور ہے۔ تا آنکہ یہ سلسلہ معرفت کامل پر جاکر منتہی ہوتا ہے، یعنی بندہ کو ہر شے کا مبدأ و مرجع ذات خداوندی ہی محسوس ہونے لگتی ہے، اسرار قدرت اس پر روشن ہونے لگتے ہیں، وہ خالق ہی کے کان سے سنتا ہے، اسی کی حمد و ثنا، شکر و دعا میں لگ جاتا ہے،

اب ذیل میں باقی چھ بابوں میں سے جستہ جستہ کے صرف عنوانات ملاحظہ فرمائیے، اوپر کے مختصر تعارف کے بعد یقین ہے کہ محض "لفافہ" سے "مضمون" کا اندازہ ہو جائے گا،

(۴) المقالۃ الرابعۃ فی مراتب الموت عن الخلق والھویٰ والارادۃ (صفحہ ۱۱)	چوتھا باب، مخلوقات اور خواہش اور ارادہ کی طرف سے فنا کے مراتب میں،

(۵) المقالۃ الخامسۃ فی تشبیہ حال الدنیا واشتغال اھلھا بھا (ص ۲۵-۲۶)	پانچواں باب، دنیا اور دنیا کی طرف اہل دنیا کی مشغولیت کی مثال میں،
(۶) المقالۃ السادسۃ فی الغنا من الخلق والھوی (ص ۲۶-۴۰)	چھٹا باب، مخلوقات اور خواہش سے بے نیازی کے بیان میں،
(۹) المقالۃ التاسعۃ فی بیان الکشف والمشاھدۃ (ص ۶۱-۶۴)	نواں باب کشف ومشاہدہ کے بیان میں،
(۱۰) المقالۃ العاشرۃ فی بیان مخالفۃ النفس (ص ۶۴-۶۸)	دسواں باب مخالفت نفس کے بیان میں،
(۱۳) المقالۃ الثالثۃ العشر فی التعلیم علی قضاء اللہ و قدرہ (ص ۸۱-۸۹)	تیرہواں باب قضائے الٰہی کی تسلیم ورضا کے بیان میں،
(۱۶) المقالۃ السادسۃ عشر فی المنع عن الاعتماد علی الخلق والاسباب (ص ۹۴-۱۰۰)	سولہواں باب، مخلوقات اور اسباب پر تکیہ کرنے سے ممانعت کے بیان میں،
(۱۷) المقالۃ السابعۃ عشر فی معنی الوصول الی اللہ سبحانہ (ص ۱۰۰)	سترہواں باب وصول الی اللہ کے معنی کے بیان میں۔
(۱۸) المقالۃ الثامنۃ عشر فی بیان معنی الرضاء (ص ۱۱۰-۱۱۵)	اٹھارہواں باب، رضا کے معنی کے بیان میں،
(۲۳) المقالۃ الثالثۃ والعشرون فی بیان القناعۃ (ص ۱۲۳-۱۲۷)	تیئسواں باب قناعت کے بیان میں،

(۲۷) المقالۃ السابعۃ والعشرون فی بیان الخیر والشر (ص۱۵۵-۱۶۹)
ستائیسواں باب خیر و شر کے بیان میں،

(۳۸) المقالۃ الثامنۃ والثلثون فی بیان الصدق والاخلاص فی سبحانہ تعالیٰ (ص۲۲۷-۲۲۸)
اڑتیسواں باب اللہ تعالیٰ کے حضور میں صدق و اخلاص رکھنے کے بیان میں،

(۴۸) المقالۃ الثامنۃ والاربعون فی حماقۃ من یشتغل بالنوافل وعلیہ فرائض (ص۲۷۵)
اڑتالیسواں باب اس شخص کی حماقت کے بیان میں جس پر فرائض باقی ہوں اور وہ نوافل میں مشغول ہو جائے۔

(۵۰) المقالۃ الخمسون فی الزھد
پچاسواں باب زہد کے بیان میں۔

(۶۱) المقالۃ الحادی والستون فی بیان الورع والتقویٰ (ص۳۴۳-۳۴۴)
اکسٹھواں باب، پرہیزگاری اور تقویٰ کے باب میں،

(۶۳) المقالۃ الثلثۃ والستون فی بیان الاخلاص والریا (ص۳۶۱)
ترسٹھواں باب اخلاص اور ریاکاری کے بیان میں،

(۷۱) المقالۃ الحادی والسبعون فی الصبر مع البلاء (ص۳۷۹-۳۸۴)
اکہترواں باب مصیبتوں پر صبر کے بیان میں،

(۷۸) المقالۃ الثامنۃ والسبعون فی بیان الخصال العشرۃ لارباب المحاسبۃ والمجاھدۃ (ص۴۰۶ و ۴۱۸)
اٹھترواں باب اہل محاسبہ و مجاہدہ کی دس خصلتوں کے بیان میں،

اب ذیل میں متفرق مقامات سے چار اقوال و تعلیمات ملاحظہ کرتے چلئے،
باب ۵، میں شیخ اپنے فرزند کو دو دستور العمل بتاتے ہیں، جس سے انسان عارف

کامل بن سکتا ہے، آج کل کے "قادری" مشایخ کو یہ سُن کر بڑی ہی مایوسی ہوگی، کہ ان کے شیخ الشیوخ کے اس دستور العمل میں نہ کہیں تعلیم یا غوث پکارنے کی ہے، نہ کہیں یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیأللہ کا نعرہ لگانے کی، نہ بڑی گیارہویں منانے کی، نہ خرقہ وجبہ کی زیارت کی، نہ کوئی نیاز، چڑھاوا، توشہ ماننے کی، بلکہ تمامتر تاکید ہے پابندی شریعت کی اور ضبط نفس اور مجاہدہ اور ادائے حقوق عباد کی، ارشاد ہوتا ہے:-

اوصیك بتقوی اللہ وطاعتہ ولزوم ظاهر الشرع وسلامة الصدر وسخا النفس وبشاشة الوجه وبذل الندى وكف الاذى وحمل الاذى والفقر وحفظ حرمات المشائخ وحسن العشرة مع الاخوان والنصيحة للاصاغر وترك الخصومة مع الارفاق وملازمة الايثار ومجانبة الادخار (۲۹۵-۲۹۶)

میں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ کا تقویٰ اور طاعت اختیار کرو، اور احکام شریعت کی پابندی لازم رکھو اور سینہ کو نجاست نفس سے صاف رکھو اور نفس میں جوانمردی رکھو، اور کشادہ رو رہو، اور جو شے عطا کرنے کے قابل ہو اسے عطا کرتے رہو، اور ایذادہی سے باز رہو، اور خود آزار خلق کا تحمل کرتے رہو، اور آداب درویشی نگاہ میں رکھو، اور بزرگوں کی بزرگداشت کرتے رہو، اور برابر والوں سے حسن معاشرت رکھو اور خردوں کو نصیحت کرتے رہو اور اپنے رفیقوں سے جنگ نہ کرو اور ایثار کو اپنے

اوپر لازم کرلو اور ذخیرہ مال فراہم
کرنے سے بچو۔

فقر کی حقیقت، دو لفظوں میں بیان فرمادی ہے :۔

وحقیقۃ الفقران لا تفتقر	فقر کی حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہی جیسی
الیٰ من ھو مثلک (صـ ۳۹۶)	ہستی (یعنی کسی بندہ) کا محتاج نہ رہ،

طریق تصوف کی تحصیل کس طرح انسان کے لئے ممکن ہے؟

والتصوف ما اخذ من القیل	قیل و قال (بحث و گفتگو) سے
والقال ولکن اُخذ من الجوع	نہیں بلکہ گرسنگی سے اور دنیا کی
وقطع المعروفات والمستحنات	خوشگوار و محبوب اشیا کے ترک سے،

طریقت کی بنیاد کار ان آٹھ خصلتوں پر ہے، اُن میں سے ہر ایک کا مظہر ایک ایک نبی ہوا ہے، ان کے نقش قدم کی پیروی طالب سالک کے لئے ناگزیر ہے،

التصوف مبنی علی ثمان	تصوف آٹھ خصلتوں پر مبنی ہے،
خصال السخا لابراھیم والرضا	سخاوت ابراہیمؑ پر، رضائے اسحٰقؑ
لاسحٰق والصبر لایوب الاشارۃ	پر، صبر ایوبؑ پر، مناجات زکریاؑ
لزکریا والغربۃ لیحییٰ ولبس	پر، غربت یحییٰؑ پر، خرقہ پوشی
الصوف لموسیٰ والسیاحۃ	موسیٰؑ پر، تجرد عیسیٰؑ پر اور فقر
لعیسیٰ والفقر لمحمد صلی اللہ علیہ وسلم	محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر،

ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ ایک پیر مرد آپ سے دریافت کر رہے ہیں کہ بندہ کو اللہ سے قریب کرنے والی کون سی چیز ہے، آپ نے فرمایا کہ جو شے قرب الٰہی پیدا کرتی ہے، اس کا ایک درجہ ابتدائی ہے اور ایک انتہائی، درجۂ ابتدائی ورع (ممنوعات شرعی سے احتراز) ہے، اور درجۂ انتہائی رضا و تسلیم و توکل (صـ ۳۷۱)

لوگوں نے مدت سے ساری توجہ کا مرکز اوراد واشغال یا نوافل کو بنا رکھا ہے اور فرائض وواجبات کو گویا بھلا دیا ہے، اور اسی کو درویشی سمجھ رہے ہیں، ایسے کم فہم آپؒ کے زمانہ میں بھی تھے، لیکن آپ کا ارشاد ہے،

ینبغی للمومن ان یشتغل اولاً بالفرائض فاذا فرغ منها اشتغل بالسنن ثم یشتغل بالنوافل فمن لو یفرغ من الفرائض فالا لاشتغال بالسنن حمق و رعونة فان اشتغل بالسنن والنوافل قبل الفرائض لم یقبل منه واھین، (صـ ۲۷۲)	مومن کو چاہیئے کہ سب سے پہلے فرائض پر توجہ کرے، جب یہ ادا کر چکے تب سنتوں کو اختیار کرے، اسکے بعد نوافل پر متوجہ ہو، لیکن جو شخص ابھی فرائض ہی سے فارغ نہیں ہوا ہو اس کے لئے سنتوں میں مشغول ہو جانا حماقت و نادانی ہے، اس لئے کہ ادائے فرض کے بغیر سنن و نوافل غیر مقبول رہیں گے اور جو شخص ایسا کرے گا خوار ہوگا،

فرائض کو چھوڑے ہوئے سنن و نوافل میں مشغول ہونے والے کی

فمثله کمثل رجل یدعوه الملک الی خدمته فلا یاتی الیه ویقف بخدمة الامیر الذی هو غلام الملک، و خادمه وتحت یدیه	مثال اس شخص کی سی ہے کہ اسے بادشاہ تو اپنے پاس بلا رہا ہو، اور وہ بادشاہ کے حضور میں تو نہ جائے، بلکہ ایک امیر کی خدمت میں حاضر رہے جو خود ہی اس بادشاہ کا زیردست اور چاکر اور غلام ہے،

نمازی جب تک فرض نہ ادا کرے، اس کے نوافل غیر مقبول رہتے ہیں، صفحہ ۲۷۶ اسی طرح اس نمازی کے نوافل جو سنتوں کو چھوڑ نوافل ادا کر رہا ہو، صفحہ ۲۷۶) اور نمازی کی سنتیں اور نفلیں تو پھر بھی ایک درجہ رکھتی ہیں، جب ان کا یہ حال ہے، تو پھر ان طبع زاد اوراد و اذکار، وظیفوں اور عزیمتوں میں مشغولی کی کیا بساط ہے، جن کی کوئی سند ضعیف بھی، رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتی! اور اکثر اُن سے مقصود بھی دنیا ہی کسی نہ کسی شکل سے ہوتی ہے!

ایک قول اور سُن کر کتاب کا ورق اُلٹ دیجیے ارشاد ہوا ہے کہ شرک محض صنم پرستی کا نام نہیں، بلکہ اپنی خواہش نفس کی پیروی کرنا، یا اللہ کے علاوہ غیر اللہ کی طلب کرنا، یہ سب شرک میں داخل ہے۔ (صفحہ ۴۲-۴۳)

"قادریت" کے اس سب سے بڑے صحیفہ کے اس اجمالی مطالعہ کے بعد للہ ارشاد ہو کہ آج "مشایخ قادریہ" کو اپنے جن رسوم پر ناز ہے، اور جن بدعتوں کا نام انھوں نے طریق قادریہ رکھ لیا ہے، انھیں حضرت شیخ جیلانیؒ کے تعلیم کئے ہوئے نفس تصوف سے کوئی بھی نسبت ہے؟

(۵) عوارف المعارف[۱]

(شیخ شہاب الدین سہروردیؒ)

(الف) تصنیف

پورا نام ابوحفص شہاب الدین عمر بن محمد البکری سہروردی ہے، عام لقب شیخ الشیوخ تھا، معاصر صوفیہ دور دور سے ان سے مسائل دریافت کرتے، اور مباحث تصوف کی تحقیق میں ان سے رجوع کرتے،

ولادت ماہ رجب ۵۳۹ھ میں ہوئی، وفات محرم ۶۳۲ھ میں ہوئی ۹۳ سال کی عمر پائی، مولد عراق عجم کا قصبہ سہرورد تھا، مزار بغداد میں ہے، قیام عموماً بغداد ہی میں رہا۔

والد ماجد کا نام شیخ محمد قریشی ملتا ہے، سلسلۂ نسب ۱۲ واسطوں سے حضرت صدیق اکبرؓ تک پہونچتا ہے، مرجع خلائق تھے، حضرات صوفیہ میں ایک مسلم امام سمجھے گئے ہیں، بلکہ چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ کی طرح ایک مستقل سلسلہ

---

[۱] ماخذ:- (۱) نفحات الانس (جامیؒ) کلکتہ
(۲) سفینۃ الاولیاء (دارا شکوہ) لکھنؤ
(۳) خزینۃ الاصفیاء جلد ۲ (غلام سرور) لاہور
(۴) رنیۃ العلوم (دارشیقی) دہلی

سہروردیہ کے بانی،

ان کے حقیقی چچا شیخ ابوالنجیب سہروردیؒ خود ایک مشہور عارف اور صاحب سلسلہ بزرگ ہوئے ہیں، پہلے اُنہی کے مُرید ہوئے، اور پرورش بھی انہی کے سایۂ عاطفت میں پائی، لیکن طبیعت کا رجحان علم کلام کی جانب تھا، فن کی متعدد کتابیں ازبر کرلی تھیں شفیق چچا اکثر اس سے روکتے تھے، طبیعت کوئی اثر قبول نہ کرتی، ایک روز وہ حضرت شیخ جیلانیؒ کی خدمت میں انھیں ہمراہ لے کر حاضر ہوئے، شیخ کا سن وفات ۵۶۱ھ ہے، اس لئے شیخ شہابؒ کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ ۲۰۔۲۱ سال کی ہوگی، چچا نے راستہ میں فرمایا کہ "دیکھو ایک ایسے بزرگ کی خدمت میں حاضر ہورہے ہیں، جن کا قلب اللہ تعالیٰ کی خبر دیتا ہے، ان کے دیدار کی برکتیں حاصل کرنا" حضرت کی خدمت میں پہونچ کر انھوں نے عرض کی کہ "حضرت میرا یہ بھتیجا علم کلام میں مشغول رہا کرتا ہے، ہرچند روکتا ہوں اثر نہیں ہوتا" حضرت نے اُن سے مخاطب ہوکر پوچھا "عمر کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں؟ انھوں نے نام گنائے، حضرت نے سن کر اپنا دست مبارک ان کے سینہ پر پھیرا، روایت کے راویوں نے آگے خود شیخ کا یہ بیان نقل کیا ہے[1] کہ

> "ہاتھ کا پھیرنا تھا کہ بجز ایک لفظ بھی مجھے ان کتابوں کا یاد نہ رہ گیا، خدا نے تمام مسائل کلامیہ میرے دل سے محو کردیئے اور قلب کو علم لدنی سے لبریز کردیا"

علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے، ابن نقیؒ کے الفاظ ہیں،

کان فقیہاً فاضلاً صوفیاً	فقیہ فاضل تھے، صوفی متقی تھے،
ورعاً عارفاً زاهداً عابداً	زاہد عارف تھے، اپنے زمانہ میں

[1] یہ بیان مشتبہ اس لئے کہ علم کلام بہرحال دین ہی کی خدمت اور اہم خدمت کے لئے ہے، اگر اس کے بجائے فلسفہ کا نام ہوتا تو روایت قرین قیاس ہوجاتی۔

مشیخ و قتہ فی علم الحقیقۃ علم طریقت کے شیخ تھے، تربیت
والیہ المنتہی فی تربیۃ المریدین مریدین میں کامل تھے۔
شیخ کے مریدین بہ کثرت تھے، اور کامل و فاضل جو بجائے خود صاحب سلسلہ
ہوئے ہیں، مثلاً شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، شیخ حمید الدین ناگوریؒ، شیخ نجیب الدین
علی برغش وغیرہم
متعدد تصانیف چھوڑیں، نام صرف چند کے معلوم ہیں،
۱۔ رشف النصائح،
۲۔ اعلام الہدیٰ فی عقیدۃ ارباب التقی،
۳۔ بہجۃ الاسرار (مناقب غوث اعظم)
۴۔ عوارف المعارف،

(ب) تصنیف

عوارف المعارف کا سنہ تصنیف ۵۶۰ھ ہے، شیخ اس وقت بہت ہی کمسن
تھے تاہم کتاب کو صوفیہ میں پوری طرح حسن قبول حاصل ہے، اور یہ کتاب ہر طبقہ میں
مستند سمجھی گئی ہے، بلکہ متاخرین کے سلوک کے علمی حصہ کا بڑا ماخذ کہنا چاہیئے کہ یہی
کتاب ہے، اصل عربی میں متعدد بار چھپ چکی ہے، فارسی ترجمے ایک سے زائد ہو چکے
ہیں، اردو میں بھی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔
کتاب کے دو حصے ہیں، اور ۶۳ باب، ۳۲ باب حصہ اول میں اور ۳۱ حصہ دوم میں
خطبۂ کتاب (آج کی اصطلاح میں مقدمۂ کتاب) میں حمد و نعت کے بعد ہی
سبب تالیف یہ بیان کرتے ہیں کہ گروہ صوفیہ میں انحطاط پیدا ہو چکا ہے، ان کے
اعمال فاسد ہوتے جاتے ہیں، ان کے نقال بہت سے پیدا ہو گئے ہیں، اتباع کتاب

سنت کا سر رشتہ ہاتھوں سے چھوٹ گیا ہے، اور خلقت حقیقت تصوف کی جانب سے بدگمان ہو چلی ہے۔

اس کے بعد ابواب کتاب کی فہرست درج کرتے ہیں، جو اس زمانہ کے دستور سے الگ ایک چیز تھی، اور اس کے خاتمہ پر جنید بغدادی کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہ

"ہمارے اس علم (طریقت) کی بساط سالہا سال ہوئے کہ لپیٹ کر رکھدی گئی، اور ہم اب اس جگہ کے حاشیہ پر گفتگو کر رہے ہیں، خود بہ صد تاسف و حسرت فرماتے ہیں کہ:-

بدا هذا القول منه فی وقت	یہ اس وقت ارشاد ہوا تھا جبکہ
مع قرب العهد بعلماء السلف	وہ وقت علمائے سلف و صلحائے
وصالحی التابعین فکیف	تابعین کے قریب تھا، تو اب
بنا مع بعد العهد وقلة العلماء	ہمارے زمانہ کا کیا بیان ہو جبکہ
الزاهدين والعارفين	اس ندر زمانہ اور گذر چکا ہے،
بحقائق علوم الدين	اور علمائے زاہدین اور حقایق
	دین کے عارف کم ہو گئے ہیں۔

انحطاط طریق کی یہ صورت سنہ ۵۶۰ھ میں تھی، آج سنہ ۱۳۸۹ھ ہے[1]، اس سوا آٹھ سو برس میں پستیاں کتنی حد سے گذر چکیں، ان کی تفصیل کے لئے کوئی قلم میں قوت کہاں سے لائیے؟

مطالب کتاب کے ایک سرسری و اجمالی اندازہ کے لئے عنوانات پر جستہ جستہ نگاہ کافی ہوگی،

(۱) فی ذکر منشاء علوم الصوفیہ (صـ ۵ ـ ۱۰)

---

[1] کتاب کے پانچویں اڈیشن کے مسودہ کے وقت۔

اس میں علم تصوف اور علوم متعلقہ کی ابتدائی تاریخ اور ان کے مبداء اور منشا کا بیان ہے۔

(۲) فی ذکر تخصیص الصوفیہ بحسن الاستماع (صـ ۱۱-۱۶)

اس میں کلام الٰہی اور کلام رسولؐ کے حسن استماع اور اس کی برکتوں کا ذکر ہے،

(۵) پانچواں باب ماہیت تصوف پر ہے، (صـ ۲۹-۳۳)

(۷) تا (۹) یہ تین باب متصوف، ملامتی اور مصنوعی اہل تصوف پر ہیں، صـ ۳۶-۴۴

(۱۰) یہ باب مرتبۂ مشیخت کی شرح میں ہے، (صـ ۴۴-۴۶)

(۱۳) تا (۱۵) یہ تین باب اہل خانقاہ و اہل صفہ کی باہمی نسبت و تعلقات کے بیان میں ہے، (صـ ۵۵-۶۳)

(۱۶) تا (۱۸) یہ تین باب صوفیہ کے آداب سفر و قیام اور ان کے متعلقات پر ہیں، (صـ ۶۳-۷۰)

(۲۱) صوفیہ مجرد و متاہل کے احوال و مقاصد میں (صـ ۸۸-۹۱)

(۲۲) تا (۲۵) یہ چار باب سماع اور اس کے متعلقات کے آداب و شرائط کے نذر ہیں، (صـ ۹۱-۱۰۹)

(۲۹) و (۳۰) ان دو بابوں میں اخلاق صوفیہ کا بیان ہے (صـ ۱۲۰-۱۴۵)

(۳۲) فی آداب الحضرۃ الالٰہیۃ لاہل القرب، (صـ ۱۴۷-۱۵۰)

اہل قرب کے آداب حضوری پر ہے،

یہاں جلد اول ختم ہوگئی، آگے جلد دوم کے صفحات کے ہندسے ہیں،

(۳۳) تا (۳۵) تین باب مقدمات طہارت وضو اور اسرار وضو کے بیان میں ہیں، (صـ ۲-۸)

(۳۶) تا (۳۸) نماز اور اس کے فضائل، آداب و اسرار کا بیان

ہے (صک-۲۲)

(۳۹) تا (۴۱) روزہ اور اس کے فضائل واسرار کا بیان ہے (صک ۲۳-۲۷)

(۴۴) آداب ولباس پر ہے (صک ۳۳-۳۷)

(۴۵) و (۴۶) فضائل شب بیداری پر اور اسباب معین شب بیداری پر ہیں، (صک ۳۷-۴۱)

(۴۸) عبادات شب کی تقسیم میں ہے، (صک ۴۵-۴۷)

(۵۰) عبادات روز کی تقسیم میں ہے، (صک ۵۲-۵۹)

(۵۱) فرائض وآداب مرید پر ہے، (صک ۵۹-۶۵)

(۵۶) معرفت نفس ومکاشفۂ صوفیہ کے بیان میں ہے، (صک ۷۹، ۸۸)

(۵۸) حال ومقام کی تشریح اور ان کا فرق، (صک ۹۲-۹۵)

(۶۰) مقامات کی تفصیل اور اس ضمن میں توبہ، صبر، ورع، فقر، شکر، خوف، رجا، توکل ورضا کا بیان، (صک ۱۱۰-۱۱۱)

(۶۱) احوال کی تشریح ہے، (صک ۱۱۱-۱۲۱)

(۶۲) بعض مصطلحات صوفیہ کی تشریح، جمع وتفرقہ، تجلی واستتار، غیبت وشہود، وغیرہ کا بیان (صک ۱۲-۱۲۹)

اکثر اکابر صوفیہ کی طرح شیخ سہروردی بھی کتاب اللہ وسنت رسولؐ پر عبور رکھتے تھے، علوم قرآن کے فاضل اور فقہ وحدیث کے عالم تھے۔ جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں برابر قال اللہ وقال الرسول سے استناد کرتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جو باب اصولی وتعلیمی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں اکثر کا عنوان ہی کسی آیت یا حدیث کو رکھتے ہیں۔ گویا اس باب میں جو کچھ بیان ہوگا وہ قرآن وحدیث ہی سے مستنبط ہوگا؛ چند مثالیں اسکی بھی قابل ملاحظہ ہیں،

باب ۲۹ شرح حال اخلاق صوفیہ پر ہے۔ اس کا آغاز اس پورے ارشاد نبوی سے کرتے ہیں:۔

قال انس بن مالکؓ قال لی رسول اللہ صلعم یا بنی ان غدوت ان تصبح وتمسی ولیس فی قلبک غش لاحد فافعل ثم قال یا بنی وذالک من سنتی من احیاء سنتی فقد احیانی ومن احیانی کان معی فی الجنۃ	انس بن مالک کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے فرزند اگر تم صبح اور شام اس حال میں کرو کہ تمھارے دل میں کسی کی طرف سے میل نہ ہو تو ایسا کرو، پھر فرمایا اے فرزند میری سنت ہے، جس نے میری سنت کو زندہ کیا، اس نے خود مجھے زندہ کیا، اور جس نے مجھے زندہ کیا وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔

باب ۳۰ ادائے حقوق صحبت واخوت پر ہے، اس عنوان کو زینت آیات ذیل دے رہی ہیں۔

۱۔ وتعاونوا علی البر والتقوی

۲۔ وتواصو بالحق وتواصو بالمرحمۃ

۳۔ اشداء علی الکفار رحماء بینھم

باب ۳۱ مقامات سلوک پر ہے، اس کے تحتانی عنوانات میں مقام ورع کا آغاز اس حدیث سے کرتے ہیں، ملاک دینکم الورع

اور مقام خوف کا اس حدیث سے راس الحکمۃ مخافۃ اللہ

اور مقام رجاء کا اس حدیث سے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اللہ عز وجل اخرجوا من النار من کان فی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من ایمان ثم یقول وعزتی وجلالی

لا اجعل آمن بی فی ساعۃ من لیل او و نھار فکن لا ید من بی

باب ۳۳ مقدمات و آداب طہارت پر ہے، اس باب کا سرنامہ ذیل کی آیہ شریفہ کو بناتے ہیں، فیہ رجال یحبون ان یتطہروا واللہ یحب المطہرین

اس وقت یہ جو عام خیال پھیلا ہوا یا پھیلا دیا گیا ہے کہ تصوف و طریقت دین اسلام سے الگ ایک مستقل نظام مذہبی کا نام ہے، اور اس خیال کے پھیلانے والوں میں یورپ کے پڑھے لکھے "مستشرق" بھی کسی سے پیچھے نہیں، تو اس خیال کی کامل اور قطعی تردید کے لئے اس رسالہ کے آخری باب بالکل کافی ہیں، ان میں طاؤس الفقراء سراجؒ، شیخ علی ہجویریؒ، امام ابوالقاسم قشیریؒ، اور شیخ جیلانیؒ کے حوالوں سے یہ پوری طرح ظاہر ہو چکا ہے کہ تصوف اپنی اصلی اور خالص صورت میں اسلام سے الگ ہونا تو کجا، اسی کی کامل ترین صورت کا نام ہے، اور اس میں بیرونی عنصروں کی آمیزش تو اس وقت شروع ہوئی، جب خود تصوف میں اختلاط شروع ہو چکا تھا، اور دین کے ہر شعبہ اور ہر گوشہ میں بدعات داخل ہونے لگی تھیں۔

شیخ سہروردیؒ بھی اس باب میں دوسرے اکابر طریقت کے بالکل ہمزبان ہیں، ان کے نزدیک تصفیۂ قلوب اور تزکیۂ نفوس براہ راست تعلیمات مصطفویؐ کا ثمرہ ہے اور جو شخص اس سرچشمۂ رشد و ہدایت سے جتنا زیادہ سیراب ہوا، اسی قدر صفائے قلب و تزکیۂ نفس سے بھی وہ زیادہ بہرہ اندوز ہوا، (عوارف صہ ۶)

تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، علم الفرائض، معانی و بیان، لغت و نحو، غرض سارے علوم ظاہر جو فہم شریعت میں کام آتے ہیں، اور بہ ظاہر ضد تصوف سمجھے جاتے ہیں، حقیقۃً وہ سب مقدمات و مبادی طریقت کا کام دے سکتے ہیں، (صہ ۸)

خلقت کی اصل ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے، ساری کائنات اسی

کے طفیل میں ہے، اور یہی ذاتِ اقدس دنیا میں علم و ہدایت لے کر آئی، پس جو شخص اپنی پاکیزہ طینتی کے لحاظ سے جتنا زیادہ قرب و مناسبت اس جوہر گرامی سے رکھتا ہے، اُسی قدر وہ علم و ہدایت سے بہرہ اندوز ہوتا ہے، اور دوسروں کی ہدایت کا باعث بنتا ہے، یہی گروہ، گروہ صوفیہ ہے، یا قرآن کی اصطلاح میں گروہ مقربین (ص ۱۰۹)

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :-

فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه اولئک الذین هداهم الله واولئک هم اولوا الالباب (زمر ع ۲)

اے پیمبر! آپ ہمارے ان بندوں کو مژدہ پہونچا دیں جو ہمارے کلام کو حسن استماع کے ساتھ سنتے اور اکی اچھی باتوں پر چلتے ہیں، یہی لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی ہے، اور یہی لوگ صاحب عقل سلیم ہیں۔

گویا ہدایت کا اصل راز حسن استماع ہے، پھر صوفیہ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ آیت بالا کے لفظ "اولوا الالباب" میں جس شے کو "لب" یا دانش سے تعبیر کیا ہے، اس کے کل حصے سو ہیں، ان میں سے ننانوے حضرت رسالت کے حصہ میں آگئے، باقی ایک حصہ تمام کائنات کے مومنین پر تقسیم ہوا ہے، یہ مقدار بجائے خود اکیس حصول پر شامل ہے، اس کے ایک حصہ یعنی کلمۂ شہادت میں سب کلمہ گو برابر کے شریک ہیں، رہے باقی بیس حصے، سو ان میں مومنین بہ لحاظ اپنی قوت ایمانی کے ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں، آیۂ بالا میں جس اَحسَنُ القول کا ذکر ہے، وہ وہی ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ بس جو شخص اس کے اتباع اور اس کے حسن استماع میں جتنا زیادہ انہماک رکھے گا، اسی قدر وہ صفت تقرب سے زیادہ موصوف ہوگا

اور اسی صفت رکھنے والے کا نام صوفی ہے (صـ ۱۳)

اور یہ جو کلام مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ

یا ایہا الذین آمنوا استجیبو اللہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم (انفال ـ ع ۲)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی دعوت کو بہ گوش ہوش قبول کرو جب رسول خدا انھیں اس امر کی جانب دعوت دیتے ہیں جو تم میں نئی نئی روح پھونکتا ہے،

سو شیخ واسطیؒ نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ زندگی سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے کو تمام علائق سے لفظاً و عملاً ہر طرح آزاد کر لے' اور بعض صوفیہ اس کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ

استجیبوا اللہ بسرائرکم وللرسول بظواھرکم فحیاۃ النفوس بمتابعۃ الرسول صلعم و حیاۃ القلوب بمشاھدۃ الغیوب وھو الحیاء من اللہ تعالیٰ بروئیۃ التقصیر (صـ ۲۲)

اللہ کی دعوت قبول کرو اپنے باطن سے اور رسول کی دعوت اپنے ظاہر سے اس لئے کہ نفوس کی حیات عبارت ہے' پیروی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور قلوب کی حیات عبارت ہے مشاہدہ غیب سے جس کے معنی یہ ہیں کہ گناہ کے مواجہہ میں حق تعالیٰ سے شرم کی جائے'

ان مقدمات سے صرف ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا اور وہی شیخ نے نکالا ہے، یعنی تصوف نام ہے قولاً، فعلاً، حالاً ہر حیثیت سے اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا (صـ ۲۶) اور اسی پر مداومت سے جب اہلِ تصوف کے نفوس مقدس

ہو جاتے ہیں، حجابات اٹھ جاتے ہیں، اور ہر شے میں اتباع رسول ہونے لگتا ہے، تو اب حق تعالیٰ ان سے محبت کرنے لگتا ہے، اس لئے کہ وعدہ الٰہی موجود ہے،

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ	کہ اے پیغمبر آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا،

پیروی رسولؐ عین محبت الٰہی کی علامت ہے اور پیروی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا صلہ بھی محبت الٰہی قرار دیا گیا ہے،

فاوفر الناس حظا من متابعة الرسول اوفرهم حظا من محبة اللہ تعالیٰ والصوفیة من بین طوائف الاسلام ظفروا بحسن المتابعة (ص ۲۶)	پس جو شخص جتنا زیادہ متبع رسولؐ ہے اسی قدر زیادہ وہ محبت الٰہی کا بھی حصہ دار ہے، اور صوفیہ ہی نے اسلامی گروہوں میں سب سے بڑھ کر اتباع رسولؐ کیا ہے۔

حیاتِ نبوی کے جتنے بھی شعبے ممکن ہیں، ان سب میں صوفیہ ہی نے سب سے بڑھ کر اتباعِ سنتِ نبوی کا حق ادا کیا ہے، مثلاً اعمالِ نبوی میں کثرتِ عبادات و قیام تہجد و نوافل صوم و صلوٰۃ کا اور اخلاق نبویؐ میں عفو و حلم و دانت و رحمت و حیا و تواضع کا اور اقوال نبویؐ میں مدارات و نصیحت کا اور احوال نبویؐ میں زہد و توکل، صبر و رضا، خشیت و ہیبت کا، تو گویا گروہ صوفیہ

فاستوفوا جمیع اقسام المتابعة وحیواسنة باقصی الغایات (ص ۲۷)	نام ہے اس گروہ کا جس نے ہر قسم کی پیروی رسول کا حق ادا کر دیا اور سنت رسول کو انتہائی درجہ تک زندہ کر دیا

بس یہی گروہ صوفیہ صافیہ درحقیقت اس بشارت عظیم کا بھی اہل ہے، جو حدیث نبوی میں وارد ہوئی ہے کہ،

من احیاء سنتی احیانی ومن احیانی کان معی فی الجنة	جس نے میرے طریقہ کو زندہ کیا اس نے مجھے زندہ کردیا، اور جس نے مجھے زندہ کردیا، وہ میرے ہمراہ جنت میں ہوگا،

شیخ عبدالواحد بن زیدؒ صوفیۂ قدیم کے ایک مسلّم سرخیل ہوئے ہیں، ان سے لوگوں نے صوفی کی تعریف دریافت کی تو انھوں نے کہا، کہ

قال القائمون بعقولهم علیٰ فهم السنة والعاکفون علیها بقلوبهم والمعتصمون بسیدهم من شر نفوسهم هم الصوفیة	جو لوگ سنت رسول پر اپنی عقل کو صرف کرتے ہیں اور اپنے قلب سے متوجہ رہتے ہیں، اور اپنے نفس کی خباثت سے اپنے سردار و سردار کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، وہی صوفیہ ہیں۔

شیخ سہروردیؒ اس تعریف کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ

هذا وصف تام وصفهم به	یہ اچھی بہترین تعریف ہے جو کی گئی،

آج سوال صرف اتنا ہے کہ ہمارے مشائخ اور پیرزادوں اور سجادہ نشینوں میں سے کتنوں پر یہ تعریف صادق آتی ہے؟ اور جو فقر و درویشی کے مدعی، پیروی سنت و شریعت کو اپنے مرتبہ سے پست و فروتر سمجھتے ہیں، ایسے ظالموں، ناانصافوں پر صوفی کا اطلاق کسی درجہ میں بھی درست ہوسکتا ہے؟

آج پیر و مرشد بن جانے کی بڑی سند یہ ہے کہ پیر صاحب فلاں بزرگ کی اولاد میں ہیں، مخدوم زادہ ہیں، خواجہ زادہ ہیں، ولی زادہ ہیں، لیکن قدیم اکابر طریقت اس "نسبی" دلیل اور اس کے مفہوم سے بیگانہ تھے، ان کا فرمانا

یہ تھا کہ :-

ومرتبة المشيخة من اعلى الرتب في طريقة الصوفية ونيابة النبوة في الدعاء الى الله	شیخ ہونے کا مرتبہ تو طریق تصوف میں ایک اعلیٰ مرتبہ ہے، اور شیخ دعوت الی اللہ میں پیمبر کا نائب ہوتا ہے،
صفحہ ۴۵	

استحقاق کا معیار بجائے بزرگ زادگی کے اپنی ذاتی پیروی راہ حق اور اتباع مسلک خیر تھا۔

وكثيراً كان شيخنا شيخ الاسلام ابو النجيب يقول ولدي من سلك طريقي واهتدى بهدى	ہمارے شیخ شیخ الاسلام ابوالنجیب سہروردی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میرا فرزند وہی ہے جو میرے طریقہ پر چلے، اور میری راہ ہدایت اختیار کرے،
(ص۴۵)	

پھر شیخ ہو جانے کے بعد مرتبۂ کمال کا معیار بھی یہی اتباع و اقتدائے رسول ہے اگر شیخ کی یہ نسبت اقتداء و اتباع درست ہے، تو حسب وعدۂ قرآنی وہ اللہ کی نظر میں محبوب ہوگا، (ص۴۶)

آج بہت سے "بزرگوار" اپنے کو "ملامتی" اور "قلندری" اور "رسول شاہی" مشہور کئے ہوئے فرائض شرعی کو اپنے سے ساقط سمجھے ہوئے ہیں، ارتکاب منہیات میں جری ہیں، اور اپنی وضع قطع، اخلاق و معاشرت، قول و فعل سے الٹی احکام شریعت کی تحقیر ہی کیا کرتے ہیں ـــــ ملامتیہ اور قلندریہ تاریخ تصوف کے کوئی نو پیدا فرقے نہیں، ان کا وجود شیخ کے زمانہ میں بھی تھا بلکہ شیخ تو نفس طریق ملامتیہ کی عظمت کے پوری طرح قائل ہیں، لیکن اس طریق کی تشریح بھی تو انکی زبان سے سنئے :-

انه حال شریف، وعقاد عزیز، وتمسک بالسنن والآثار وتحقق بالاخلاص (حل ۴)

یہ ایک معزز حال ہو، اور بلند مقام ہے، یہ سنت نبوی و آثار صحابہ سے تمسک اور مرتبۂ اخلاص کے تحقق کا نام ہے،

ملا جامیؒ بہت بعد کے شخص ہیں، بہتر ہوگا کہ اس متن کی شرح ان کی زبان سے بھی ملاحظہ کرتے چلئے:۔

واما ملامتیہ جماعتے باشند کہ در رعایت معنی اخلاص و محافظت قاعدہ صدق و اختصاص غایت جہد مبذول دارند و در اخفائے طاعات و کتم خیرات از نظر خلق مبالغت واجب دانند تا آنکہ ہیچ دقیقہ از صوالح اعمال مہمل نہ گزارند و تمسک بہ جمیع فرائض و نوافل از لوازم شمرند و مشرب ایشاں در کل اوقات تحقیق معنی اخلاص بود، و لذت شاں در تفرد نظر حق بہ اعمال و احوال ایشاں و ہمچناں کہ عاصی از ظہور معصیت پر حذر بود ایشاں از ظہور طاعت کہ مظنہ ریا باشد

ملامتیہ اس فرقہ کو کہتے ہیں جنکی انتہائی کوشش مرتبۂ صدق و اخلاص کے برقرار رکھنے کی ہوتی ہے (کہ ریاد نمائش کی ہوا بھی اعمال و طاعات میں نہ لگنے پائے) اور وہ طاعات و حسنات کو نظر خلائق سے مخفی رکھنے میں انتہائی کوشش کر ڈالتے ہیں و انحالیکہ کوئی جزیہ بھی وہ اعمال صالح میں سے نہیں چھوڑتے ہیں، اور سارے فرائض اور نوافل کے بجالانے کا انتہائی اہتمام رکھتے ہیں اور ان کا مسلک یہ ہے کہ ہر وقت حسن اخلاص کے تحقق میں لگے رہتے ہیں، اور انھیں لذت اسی میں آتی ہے کہ ان کے اعمال و احوال

عذر کنند تا قاعدۂ اخلاص خلل نہ پذیرد" (نفحات الانس ص۹ طبع کلکتہ)

پر صرف خالق کی نظر رہے اور نہ اپنی طاعت کو نظر خلائق سے چھپانے میں ایسا ہی اہتمام رکھتے ہیں جیسا دوسرے لوگ اپنی معصیت کو چھپانے ہیں کہ کہیں اخلاص کامل میں دھبہ نہ لگ جائے اور شائبہ ریا نہ شامل ہو جائے۔

معاذ اللہ! کہاں یہ اخلاص مجسم اور پیکر طاعت و تقویٰ گروہ اور کہاں ترک احکام شریعت کا انتساب! ———— "کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا"

لیکن بہروپیوں، ریاکاروں، سوانگ بھرنے والوں کی دنیا کچھ آج سے نہیں، شیخ ہی کے زمانہ سے آباد ہے۔

فمن ذالک قوم یسمو نفوسھم قلندریۃ تارۃ و ملامیۃ اخریٰ (ص۱۷)

یہ لوگ کبھی اپنے کو قلندریہ اور کبھی ملامتیہ مشہور کرتے ہیں،

اس کے بعد شیخ نے ملامتیہ، قلندریہ اور صوفیہ کے حدود الگ الگ ظاہر کر کے پھر آگے لکھا ہے کہ

"گمراہوں کے ایک گروہ نے اپنے کو ملامتیہ مشہور کر رکھا ہے، اور صوفیہ کا لباس پہن رکھا ہے، تاکہ اس کا بھی شمار صوفیوں میں ہو، حالانکہ انہیں کوئی لگاؤ بھی صوفیہ سے نہیں، بلکہ یہ لوگ دھوکے اور گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں اور صوفیوں کا لباس کبھی اپنے کو بچانے کے لئے اور کبھی کسی دوسرے بجوی کے ساتھ پہنتے ہیں،

اور اہل اباحت[1] کی راہ چلتے ہیں، اس زعم میں پڑے ہوئے ہیں کہ انکے ضمیر اللہ کی جانب راجع اور خالص ہوگئے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہی کامیابی مقصود ہے، اور یہ کہ شریعت کی پابندیاں تو عوام کے لئے ہیں، جن کی عقلیں کوتاہ ہیں اور جو تقلید و اقتداء کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں۔

یہ عین الحاد اور زندقہ اور جہل ہے، یہ فریب میں پڑا ہوا گروہ اس حقیقت سے جاہل ہے کہ شریعت نام ہے حق عبودیت کا، اور حقیقت عبودیت ہی ہے، اور جو شخص اہل حقیقت سے آگاہ ہوگا، وہ حق عبودیت اور حقیقت عبودیت میں مقید ہوگا، (ص۴۳)

ایسے ہی بدنیوں کے باب میں حضرت عمر فاروقؓ کا یہ قول فیصل موجود ہے کہ

ان اناساً کانو ایوخذ ون	عہد رسالت میں تو لوگوں سے مواخذہ
بالوحی علی عھد رسول اللہ	وحی کی بنا پر کیا جا سکتا تھا لیکن
صلی اللہ علیہ وسلم وان الوحی	اب جبکہ سلسلہ وحی منقطع ہو چکا ہے،
قد انقطع و انما ناخذ کم	اب ہم تم سے مواخذہ تمھارے
الآن بما ظھر من اعمالکم	اعمال ہی کی بنا پر کریں گے، بس
فمن اظھر لنا خیراً امناہ	جس کے اعمال خیر ہم پر ظاہر ہونگے
وقربناہ ولیس الینا من	ہم اسے قبول کریں گے اور اس سے
سریرتہ شیٔ اللہ تعالیٰ یحاسبہ	قربت کریں گے، ہیں اس کے باطن
فی سریرتہ ومن اظھر لنا	سے کچھ غرض نہیں، اسکے باطن کا
سوئٔ ذالک لم نامنہ وان	حساب کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی،
قال سریرتی حسنۃ	لیکن اگر اس کے اعمال ذخیرہ کے

---

[1] زندیقوں کا وہ گروہ جو عملاً کسی چیز کے حرام ہونے کا قائل نہیں۔

علاوہ) دوسری صورت میں ہم پر
ظاہر ہوئے، تو ہم اُسے قبول نہیں
کرنے کے خواہ وہ کہتا رہے کہ میرا
باطن آراستہ ہے،

فاروق اعظمؓ ہی کا ایک دوسرا ارشاد بھی ہماری رہبری و رہنمائی کیلئے موجود ہے؛

فاذا رائینا متھا ونا بحدود	جب ہم کسی کو دیکھیں گے حدود شرع
الشرع مھملاً للصلوٰت	کی طرف سے غیر متوجہ، اور نماز فرض
المفروضات لا یعتد بحلاوۃ	کو چھوڑے ہوئے، اور یہ کہ وہ
التلاوۃ والصوم والصلوٰۃ	تلاوت قرآن اور روزہ اور نماز
ویدخل فی المداخل المکروھۃ۔	سے لذت نہیں پاتا اور وہ حرام و
المحرمۃ نزوۃ ولا تقلیہ	مکروہ مقامات میں در آتا ہے تو
ولا تقبل دعوا لا ان لہ	ہم اس سے انکار کریں گے اور اس
سریرۃ صالحۃ	دعویٰ کو قبول کریں گے کہ وہ باطن
	تو صالح رکھتا ہے،

جنید بغدادیؒ ایک مرتبہ معرفت الہیٰ پر گفتگو کر رہے تھے، ایک شخص نے سوال کیا کہ آیا اہل معرفت ترک اعمال صالحہ کے مقام تک بھی پہونچ سکتے ہیں؟ حضرت جنیدؒ نے طیش و برہمی کے ساتھ ارشاد فرمایا،

ان ھذا قول قوم تکلموا	یہ اُس گروہ کا قول ہے جو ترک اعمال
باسقاط الاعمال و	کا قائل ہے، میرے نزدیک یہ بہت
عندی عظیمۃ والذی	بڑی (بے باکی ہے) اور جو چوری
یسرق ویزنی احسن حالاً	کرتا ہے اور زنا کرتا ہے، اس کا

من الذی یقول ھذا و ان العارفین باللہ اخذوا الاعمال من اللہ والیہ یرجعون فیھا ولو بقیت الف عام لم انقص من اعمال البر ذرۃ الا ان یحال بی دونھا و انھا الاکد فی معرفتی واقوی لحالی

بھی حال اس قول کے اختیار کرنے والے سے بہتر ہے، عارفوں نے اپنے اعمال اللہ تعالیٰ سے حاصل کئے ہیں، اور ان ہی اعمال کیساتھ وہ اسکی جانب واپس ہوں گے میری عمر تو اگر ایک ہزار سال کی ہو جب بھی میں ان اعمال خیر سے ایک ذرہ کم نہ کروں بجز اس کے کہ کوئی میرے اور ان کے درمیان حائل ہو جائے اور یہ اعمال تو میری معرفت کے لئے موکد اور میرے حال کیلئے موجب تقویت ہیں،

اور ان جنیدؒ کا "سید الطائفہ" ہونا مسلم ہے،
لیجئے شیخ نے خود اپنے علاوہ سند اپنے سید کی اور اُن سید کے بھی سید عمر فاروق کی پیش کر دی، اب اس کے بعد بھی کوئی اور درجہ باقی رہ جاتا ہے؟

(۶) فوائد الفواد[۱]

خواجہ نظام الدین اولیاء سلطان المشائخ

(الف) مصنف

اب تک جن بزرگوں اور ان کی تعلیمات و ہدایت سے تعارف ہوا وہ سب ہندوستان سے باہر کے تھے، اور اکثر کی سکونت بھی باہر ہی رہی۔ اب ایک ایسے بزرگ کے درس و ہدایات کا سامنا ہے جو ہندوستان ہی کی خاک سے اُٹھے، اور اسی سرزمین میں اپنی ساری زندگی گذاری، اور اتفاق سے زمانہ بھی وہ پایا، جب ہندوستان کا اسلام ہندویت اور ہندیت سے اچھا خاصہ متاثر ہوچکا تھا، اور مسلمانوں کو یہاں رہتے سہتے کئی صدیاں گذر چکی تھیں،

چھٹی ہجری میں بخارا سے دو سید زادے سید علی اور سید عرب ہندوستان وارد ہوئے۔ قیام پہلے لاہور میں کیا، پھر آج کل کے اترپردیش کے شہر بدایوں

[۱] ماخذ:- (۱) سیر الاولیاء (میر خورد دہلوی)
(۲) راحت القلوب (ملفوظات خواجہ فریدؒ مرتبہ خواجہ نظام)
(۳) فوائد الفواد (ملفوظات خواجہ نظامؒ مرتبہ میر حسن سجزی)
(۴) راحۃ المحبین (" " مرتبہ امیر خسروؒ)
(۵) افضل الفوائد (" " " ")
(۶) درر نظامی (ملفوظات خواجہؒ نظامؒ مرتبہ شیخ علی محمود جاندار) قلمی
(۷) تاریخ فیروز شاہی (ضیاء برنی)
(۸) اخبار الاخیار (شیخ عبد الحق دہلوی)
(۹) نفحات الانس (ملا جامیؒ)

ہیں، اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی، بدایوں اُس وقت عالموں اور درویشوں کا شہر تھا، اور اس مناسبت سے قبۃ الاسلام کہلاتا تھا، ایک کے صاحبزادہ سید احمد کا عقد دوسرے کی صاحبزادی بی بی زلیخا کے ساتھ ہوا، اور اس عقد کا ثمرہ اُس ہستی کے قالب میں ظاہر ہوا، جس پر خاک بدایوں ہی کو نہیں خاک ہند کو ناز ہے۔ ولادت، ۲۷ صفر ۶۳۴ھ کو ہوئی، والدین نے نام فخر کائناتؐ کے اسم مبارک پر محمد رکھا، شہرتِ عام نے نظام الدین اولیا، کہہ کر پکارا، اولیائے معاصرین کی زبانیں نظام الاولیا، نظام الحق والدین، سلطان المشائخ اور محبوب الٰہی کے القاب پر کھلیں۔

شجرۂ نسب پدری و مادری دونوں سلسلوں سے بہ واسطہ سیدنا حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہونچتا ہے، عمر کا پانچواں سال تھا کہ سایہ پدری سر سے اٹھ گیا اور عرب کے یتیم کی اُمت کا یہ گوہر بے بہا بھی یتیم رہ گیا، والد ماجد حضرت سید احمد ایک متقی و مقدس بزرگ تھے (مزار بدایوں میں اس وقت تک زیارت گاہ خلائق ہے) تربیت کی ذمہ داری والدہ ماجدہ بی بی زلیخا پر پڑی، یہ اپنے زہد و تقویٰ کے لحاظ سے اپنے وقت کی رابعہ بصریہ تھیں، مزار نواح دہلی میں اب بھی عقیدتمندوں کا مرجع ہے۔

تذکروں میں ہے کہ صاحب نسبت و مستجاب الدعوات تھیں، دعاؤں کے تیر ہدف مراد تک پہونچ کر رہتے۔ کشف تکوینی بھی حاصل تھا، آیندہ واقعات بارہا منکشف ہو جاتے۔ آخری مرض میں جب مبتلا ہوئیں تو کھانا پانی سب چھوڑ دیا۔ ہر وقت گریہ طاری رہتا جمادی الاولیٰ کی آخری تاریخ کی شام تھی، نیا چاند دیکھ کر صاحبزادہ حسب دستور سلام کے لئے والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے فرمایا "بیٹے اگلے مہینے کس کے سلام کو آؤگے، اور کون دعائیں دے گا۔"

لختِ جگر کو معلوم ہو گیا سر سے یہ سایہ بھی اٹھا چاہتا ہے، رو کر عرض کی کہ "اماں جان ہم کو کس پر چھوڑے جاتی ہو؟" فرمایا کہ "اس کا جواب صبح کو لینا، اس وقت جا کر شیخ نجیب الدین متوکل کے ہاں سو رہو" رات میں نیند کسے آتی صبح سویرے گھر کی خادمہ دوڑی ہوئی پہونچی، کہ فوراً بلایا ہے، دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے، ماں نے پوچھا "بیٹا رات کو خوش رہے تھے" رو کر اور قدموں پر گر کر عرض کی کہ "اماں جان میری خوشی تو آپ کی سلامتی کے ساتھ ہے" فرمایا "اب وقت ہے کہ کل کی بات کا جواب لو" یہ کہہ کر ان کا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اور آسمان کی طرف منہ کر کے کہا پروردگار، اس دکھیارے بیکس کو تیرے سپرد کرتی ہوں" یہ کہا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

اللہ کو سونپا ہوا بچہ، بیکس و لاوارث نہیں رہ سکتا تھا۔ ذہانت، ذکاوت، فہم صحیح، شوق علم، حافظہ، یہ سب خداداد نعمتیں بچپن سے موجود تھیں، حفظ قرآن مجید کے بعد دوسرے علوم شروع کیے، اور اکثر میں پوری دستگاہ بہم پہونچائی، بدایوں خود ہی کاملین فن کا مرکز تھا، مزید ذوق علم کی کشش یہاں سے دہلی لائی، اور یہاں باقی علوم کی بھی تکمیل ہو گئی، دستار بندی بدایوں میں ہو چکی تھی، دہلی میں آکر فقہ و حدیث کی بھی باضابطہ سند و اجازت حاصل ہوئی، علوم و فنون میں بحث و گفتگو کا بڑھا ہوا شوق دیکھا طلبہ و علماء کے حلقہ میں نام [illegible] بحاث پڑ گیا،

اِدھر علوم ظاہری میں یہ انہماک جاری تھا، اُدھر فطرت ان کو ایک دوسری ہی زندگی کے لئے تیار کر رہی تھی، قیام ابھی بدایوں ہی میں تھا، اور سن بھی ۱۲ سال کے اندر ہی تھا کہ ایک قوال کی زبان سے حضرت خواجہ فرید گنج شکر کے کمالات سننے میں آئے، کہ دل غائبانہ عقیدت کا مسکن ہو گیا، یہاں تک کہ ہر نماز کے

بعد بابا فرید کا ورد شروع ہو گیا تھا، دہلی آتے ہوئے راستہ میں حضرت موصوف کے اور بھی تذکرے سنے، اشتیاق بڑھا، دہلی پہونچے تو پڑوس میں شیخ نجیب الدین متوکل کا ملا، وہ خود حضرت فریدؒ کے خلیفہ اور عزیز خاص تھے، آپ کے ذریعہ سے جو حالات و کمالات سنے، انھوں نے شوق و عقیدت کی آگ کو اور تیز کر دیا، یہاں تک کہ ایک روز جامع مسجد دہلی میں ایک خوش الحان قاری کی زبان سے آیۂ کریمہ

الم یان للذین آمنوا ان تخشع	کیا ابھی ایمان والوں کیلئے وقت نہیں
قلوبھم بذکر اللہ	آیا کہ انکے قلوب ذکر الٰہی کے آگے جھک جائیں

سن کر دل بے چین ہو گیا، اور جی میں ٹھن گئی کہ ترک علائق کر کے مرید ہو جا۔

لوگوں نے مشورہ شیخ نجیب الدین سے بیعت ہو جانے کا دیا، مگر خود شیخ نے فرمایا کہ مرید ہونا ہے تو وقت کے دو بزرگوں میں کسی سے بیعت ہو جاؤ، ایک حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، دوسرے حضرت باوا فرید اجودھنی، دوسرے ہی دن آپ دہلی سے چل کھڑے ہوئے، لیکن دل اب بھی ذرا متردد تھا کہ راستہ اجودھن اور ملتان میں سے کہاں کا اختیار کیا جائے۔ آخر ایک شب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، اور حکم ملا کہ "اجودھن کا راستہ اختیار کرو" عمر کے بیسویں سال اس سفر کی آخری منزل ختم ہوئی بعد ظہر خواجہ فریدؒ کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ جذبہ اشتیاق ادھر سے بھی زوروں پر تھا۔ سلام میں خود ہی سبقت فرمائی گئی اور نظر پڑتے ہی یہ شعر زبان مبارک پر آیا ؎

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ	سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

بیعت کے ساتھ خلعت خلافت بھی مرحمت ہوئی، اور ارشاد ہوا کہ نظام الدین میں تو ولایت ہندستان کسی اور کو دینا چاہتا تھا کہ غیب سے ندا آئی کہ انتظار کرو، نظام بدایونی آرہا ہے، اور وہی اس ولایت کے لائق ہے۔"

مرشد کی خدمت میں ایک عرصہ تک سرگرم رہنے کے بعد حسب الحکم دہلی واپس ہوئے، اور مجاہدوں اور ریاضتوں میں مصروف ہو گئے، اخفائے حال کا اسقدر اہتمام تھا کہ جہاں ایک جگہ قیام فرمانے کے بعد لوگوں کو بزرگی کا کچھ پتہ چل پایا، مکان تبدیل کر دیتے اور کسی دوسرے محلہ میں اُٹھ جاتے۔ بالآخر جب خلقت کا ہجوم زیادہ رہنے لگا، تو اشارۂ غیب پاکر شہر سے باہر جنوب میں غیاث پور میں سکونت اختیار فرمائی، اور یہیں آخر عمر تک قیام رہا، یہ وہی مقام ہے جو اب بستی نظام الدین اولیاء کہلاتا ہے،

ابتدائی زمانہ پیرو مرشد کی سنت میں بڑی تنگی و تنگدستی کا گذرا، شروع میں کئی سال تک یہ حال رہا کہ مسلسل کئی کئی دن تک کوئی آمدنی کہیں سے نہ ہوتی اور فقر و فاقہ کی نوبت رہتی، چند سال بعد مرشد کی دعا سے یا (جیسا کہ دوسری روایتوں میں ہے) کسی مجذوب کی توجہ کی برکت سے اس کے برعکس فارغ البالی پیدا ہوئی، اور وہ بھی اس قوت سے کہ اچھے اچھے رئیسوں کو رشک آنے لگا، باورچی خانہ دن رات گرم رہتا تھا، لنگر ہر وقت جاری تھا، مہمان خانہ مہمانوں کے ہجوم سے پُر رہتا تھا، اور مہمانداری کا خرچ کئی ہزار ماہوار کا تھا، اس امارت و ریاست کے ساتھ اِس درویش کی اپنی یہ حالت تھی کہ سال کے سال برابر روزہ رکھا کرتے تھے، اور افطار وسحر کے وقت، موٹے قسم کی غذا اور وہ بھی قلیل مقدار میں تناول فرماتے تھے، غرض یہ کہ یہ "خوش خوری" اور "طباخی" کے جتنے بھی انتظامات تھے، دوسروں کے لئے تھے۔ اپنی ذات کے لئے اصلا نہیں۔ خادموں پر تاکید تھی کہ جو کچھ آتا رہے روزانہ سب نکلتا بھی رہے، اور جمع مطلق نہ ہونے پائے، جمعہ کے دن اس کا اہتمام اور زیادہ ہو جاتا تھا اور جب تک توشہ خانہ مال اور غلہ سے بالکل صاف نہ کرا دیا جاتا، نماز جمعہ کے لئے تشریف نہ لیجاتے۔

نکاح کی نوبت نہیں آئی، ساری عمر تجرد میں گذری، ایک بہن تھیں، ان کی اولاد کا سلسلۂ نسل بحمد اللہ جاری ہے، اور خاندان کا سلسلۂ نسل اسی ذریعہ سے قائم ہے،

خلق کا رجوع، تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ بڑی ہی کثرت سے رہا، عوام درویش، امراء، وزراء، سب ہی اس شمع کے پروانے تھے، لیکن آپ کے استغنار کا یہ عالم تھا کہ خود کسی امیر و وزیر کے ہاں تشریف نہیں لے گئے، شکایتیں دربار شاہی تک پہونچیں اور فرمان سلطانی پہونچا کہ کبھی کبھی دربار میں حاضری ہوتی رہے، لیکن تعمیل ایسے فرمان کی کبھی نہیں کی گئی، اس طریق عمل سے بارہا عتاب سلطانی کی نوبت آئی، بلکہ کبھی کبھی سخت خطرے بھی پیش آگئے، لیکن جو گردن صرف رب الارباب کے آگے جھکنے کے لئے خلق ہوئی تھی، وہ کبھی کسی گردن کش سلطان و فرماں روا یا امیر و وزیر کے آگے نہ جھک سکی۔ دہلی کے تخت پر جب قطب الدین مبارک شاہ بیٹھا (۷۱۶ھ ۱۳۱۶ء) تو روایت ہے کہ وہ حاسدوں اور دور اندازوں کے کہے سنے میں آکر حضرت شیخ سے عناد رکھنے لگا، پہلے قسم قسم کی سختیاں کیں، اس کے بعد اس پر اصرار کیا، کہ اگر ہر ہفتہ نہیں تو اقل مرتبہ ہر مہینہ چاندرات کو دوسرے مشائخ وقت کی طرح شیخ بھی ضرور ایوان شاہی میں حاضر ہوا کریں، معتقدوں اور مریدوں نے معاملہ کی نزاکت اور غضب سلطانی کی اہمیت کا اندازہ کرکے بہ منت و الحاح عرض کی کہ کم سے کم ایک مرتبہ تو بادشاہ کی خوشی پوری کر دی جائے۔ یہاں تک کہ شوال کا مہینہ ختم ہوا اور ذیقعدہ کی چاندرات آگئی، لیکن عین اسی شب میں بادشاہ کے منظور نظر غلام خسرو خاں نے اپنے خنجر سے بادشاہ ہی کا کام تمام کر دیا۔

ہجوم خلائق سے یہ نہ ہوتا کہ کبھی ذکر و شغل میں فرق پڑ جائے، ساری رات

رات عبادت اور ریاضت کی نذر ہو جاتی، جب حجرہ کا دروازہ کھلتا تو دیکھنے والے دیکھتے، کہ شب بیداری سے ایک عجب قسم کی روحانی و نورانی مستی چہرہ پر پیدا ہو گئی ہے! ـــــــــــــ مرید خاص و مخلص با اختصاص امیر خسروؒ کا یہ شعر ایسے ہی کسی مرقع کی منظر کشی کر رہا ہے ؎

تو شبانہ می نمائی بہ بر کہ بودی امشب　　　که هنوز چشم مستت اثر خمار دارد

عمر شریف اسّی سے اوپر ہو چکی تھی، اس سن پر بھی وہی صوم مسلسل کا معمول جاری رہا،

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کے الفاظ ہیں

حق تعالیٰ اورا قبولے تمام داد و خاص و عام را بوے رجوع شد و ابواب فتوح برئے مفتوح گشت و عالمے از مواہد احباب و انعام او تمتع گرفتند و او خود بہ ریاضت و مجاہدہ می بود و گویند کہ اواخر عمر کہ سن شریفش از ہشتاد متجاوز شدہ بود بہ غایت مجاہدہ پیش گرفتہ بود و صوم دوام داشتے، و بہ وقت افطار اندک چیزے چشیدے و طعامیکہ وقت سحر بودے اکثر چناں بودے کہ نخوردے، خادم عرضہ داشت	حق تعالیٰ نے آپکو نہایت مقبول بنا دیا، اور خاص و عام سب کا رجوع آپ کی طرف ہو گیا، آپ پر فتوحات کا دروازہ کھل گیا، اور ایک عالم آپ کی مہماں نوازی اور عنایتوں سے سیراب ہونے لگا لیکن آپ خود برابر ریاضت و مجاہدہ میں لگے رہے، یہانتک کہ آخر عمر میں جب سن شریف اسی سے متجاوز ہو چکا تھا، آپ انتہائی مجاہدوں میں مشغول رہتے تھے اور صوم دوام رکھتے تھے، افطار کے وقت بہت قلیل غذا ہوتی اور

کردے کہ مخدوم وقت افطار طعام کمتر میخوردند اگر از طعام سحر اندک تناول نہ کنند حال چہ شود و ضعف قوت گیرد، دریں محل بگریستے و گفتے کہ چندیں مسکیناں و درویشاں در کنجہاے مساجد و دوکانہا گرسنہ و فاقہ زدہ افتادہ اند ایں طعام در حلق من چگونہ فرو رود و ہمچناں طعام از پیش بر می داشتند"

سحر بھی، اکثر ایسا ہوتا کہ نہ کھاتے۔ خادم عرض کرتے کہ افطار ہی کے وقت کیا غذا ہوئی تھی، اگر سحری بھی چھوٹ گئی تو ضعف و نقاہت سے کیا حال ہوگا، یہ سنکر مخدوم رونے لگتے، اور فرماتے کہ اتنے فقیر اور محتاج مسجدوں اور دکانوں کے کونوں میں بھوکے اور فاقہ سے پڑے ہیں، میرے حلق سے نوالہ کیونکر اتر سکتا ہے یہ فرماتے اور کھانا سامنے سے ہٹا دیتے،

کثرت عبادت کی یہ حالت تھی کہ ساری ساری رات نماز کی نذر ہوجاتی، نماز جماعت کا یہ اہتمام تھا کہ ۸۵ ـــ ۹۰ سال کی عمر میں ضعف و لاغری کے باوجود بالاخانے سے شریک جماعت ہونے کے لئے اتر کر نیچے تشریف لاتے، کثرت صوم کا یہ عالم تھا کہ عمر گویا روزہ ہی میں گذار دی، پانچ ممنوع دنوں کو چھوڑ کر سال کا سال، روزہ ہی میں گذرتا، عمر کی زیادتی کے ساتھ غذا میں کمی فرماتے گئے، یہاں تک کہ ضعیفی کے زمانہ میں خادم جب کھانا پیش کرتے تو آپ کبھی ایک روٹی، کبھی آدھی روٹی یا کوئی بد ذائقہ ترکاری (جیسے کریلا) نوش فرمالیتے، اور باقی سب لذیذ و نفیس غذائیں دسترخوان پر بیٹھنے والوں کے آگے پیش کردیتے، اور انھیں اصرار کرکے کھلاتے ـــــــــ خود اپنی حالت گرسنگی اور سیری کی اور خواب و بیداری کی تقریباً ایک ہی سی ہوکر رہ گئی تھی،

معمول یہ تھا کہ دن بھر کے روزہ کے بعد، بعد مغرب بالا خانہ پر تشریف لے جاتے، وہیں مریدوں اور مہمانوں کا مجمع ہوتا، دستر خوان پر رنگ رنگ کی غذائیں، میوے اور شیرینیاں ہوتیں، وہ سب دوسروں کی نذر ہو جاتیں، عشا کی جماعت ادا کرنے کو نیچے تشریف لاتے، اس کے بعد پھر اوپر تشریف لے جاتے، اس وقت باریابی کی اجازت صرف مخصوص مریدوں کو ہوتی، اکثر امیر خسرو لطائف وحکایات سناتے، اور حضرت تسبیح پڑھتے رہتے، کچھ دیر بعد یہ تخلیہ کی مجلس بھی برخاست ہو جاتی، خادم خاص خواجہ اقبال پانی چند لوٹوں میں بھر کر رکھ دیتے کہ صبح تک کئی بار طہارت و وضو کی ضرورت ہو جائے گی حضرت اندر سے دروازہ بند کر کے نماز اور ذکر و شغل میں مشغول ہو جاتے، سحری کے وقت ایک دوسرے خادم عبدالرحیم ناشتہ لے کر حاضر ہوتے، آپ دروازہ کھول کر کھانا اکثر واپس فرما دیتے، کبھی برائے نام کچھ نوش فرما لیتے، گریہ کثرت سے طاری رہتا، خادموں نے دوسرے وقتوں کے علاوہ سحری کے وقت بھی گریہ کرتے پایا، بعض خادموں نے دستر خوان پر ادھ چبے نوالے پائے، دریافت سے پتہ چلا کہ جو لقمہ لذیذ معلوم ہوتا ہے، اسے دہن مبارک سے واپس نکال کر رکھ دیا جاتا ———— آج محفل سماع کیلئے حضرتؒ کے نام کی آڑ لینے والوں میں کتنے ان ریاضتوں اور مسلسل عمر بھر کے مجاہدوں میں حضرتؒ کی تقلید کریں گے؟

وفات سے ۴۰ یوم قبل غذا بالکل ترک ہو گئی تھی کھانے کی خوشبو تک گوارا نہ تھی، گریہ وزاری بہت بڑھ گئی تھی، نفل نمازوں میں سجدے بہت کثرت سے کرنے لگے تھے، نماز سے فراغت کے بعد دریافت فرماتے، نماز میں نے پڑھ لی؟ اور جب جواب ملتا کہ پڑھ لی ہے، تو یہ فرما کر کہ "پڑھ لوں خبر نہیں کہ پھر بھی پڑھوں گا یا نہیں" پھر پڑھنے لگ جاتے، جب دنیا سے رخصت ہونے کا وقت بہت قریب

آگیا، تو اقبالؔ خادم کی طرف اشارہ کر کے سب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "اس نے کوئی چیز گھر میں باقی رکھی تو قیامت کے دن اس کی ذمہ داری اس کے اوپر ہے۔" خادم نے تھوڑی دیر بعد عرض کیا کہ "کچھ غلہ درویشوں کی خوراک کے لئے رکھ لیا ہے، باقی اور سب کچھ تقسیم کر دیا ہے" ناخوش ہو کر فرمایا کہ "اس کو بھی ابھی لٹا دو اور توشہ خانہ میں جھاڑو دے کر دو۔" تعمیل فوراً ہوئی۔

وفات صحیح تر روایت کے مطابق، چہارشنبہ ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ، ۵ اردسمبر ۱۳۲۵ء کو ۹۲ سال کی عمر میں طلوع آفتاب کے وقت ہوئی۔ مقبرہ کے لئے ایک عالیشان عمارت بڑے بڑے اونچے گنبدوں والی، زندگی ہی میں کسی بادشاہ وقت نے (آپ کے معاصر متعدد بادشاہ ہوئے ہیں) یا کسی امیر نے (باختلاف روایت) تعمیر کرادی تھی، مگر اس میں دفن ہونا پسند نہ فرمایا، اس عمارت کو حسب وصیت مسجد بنا دیا گیا" اور اس کے صحن میں تدفین ہوئی۔ شروع میں تربت خام و غیر نمایاں تھی، پختہ مزار اول بار تیمورؔ کے حکم سے بنا، مشہور یہ ہے کہ وہ یہاں جب فاتحہ پڑھنے آیا تھا تو اسے آپؒ کی تربت کا پتہ چلانے میں بڑی دقت پیش آئی تھی، اب جو اسی صحن مسجد میں مزار کی پختہ عمارت سنگ سفید کی ہے، وہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت دلکش اور دل کشا ہے، اور بعض اہل کشف کا قول ہے کہ اپنے اندر غیر معمولی کشش اور جاذبیت رکھتی ہے۔

مریدوں کی فہرست میں مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ، امیر خسروؒ، میر حسن علاء سجزی، شیخ مبارک گوپاموئی، مولانا فخر الدین زرادیؒ، شیخ شمس الدین یحییٰ کے نام خاص طور پر ممتاز ہیں، ایک ضعیف روایت یہ ہے کہ مخدوم شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی بھی مرید تھے، خلافت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی کو ملی۔

(ب) تصنیف

ہندستان کی دنیائے فقر و تصوف میں ایک خاص شہرت و امتیاز
سلسلۂ عالیہ چشتیہ کو حاصل ہے کہ ان خواجگان چشت کے "پنجتن پاک"
نے اپنی تعلیمات و ہدایات اپنے ملفوظات کے قالب میں چھوڑی ہیں،
مختلف مجلسوں میں جو کلمے ان کی زبان سے نکلتے تھے مریدان باصفا انھیں قلمبند
کر لیتے اور مرتب کر کے انہی ملفوظات مبارک کو شائع کر دیتے ——
مرشدوں کے ان ارشادات کو جمع اور مرتب کرنے والے خود اپنی اپنی نوبت
پر صاحب ارشاد اور بانی سلسلہ ثابت ہوئے! اور گو محدثین کی سی تاریخیت
اور سند متصل کا التزام بزم تصوف کی چیز نہیں، پھر بھی اپنے حدود کے اندر
شمع سے شمع اسی طرح روشن ہوتی رہی، اور نسلوں تک چراغ سے چراغ جلتا رہا۔
اکابر خواجگان چشت کے سلسلے کے خاتم حضرت نظام الدینؒ ہی ہیں، آپ کا
زمانہ ساتویں صدی ہجری کے اواخر اور آٹھویں صدی کے شروع کا ہے، آپ
کے ملفوظات جمع کرنے کی سعادت ایک سے زائد مریدان با اخلاص کے حصہ میں
آئی، چنانچہ دو الگ ملفوظات امیر خسروؒ نے راحت المحبین اور افضل الفوائد
کے نام سے مرتب کیے اور ایک شیخ علی محمود جاندارؒ نے درر نظامی کے نام سے
(یہ آخری ملفوظ اس نامہ سیاہ کے علم میں ابھی تک غیر مطبوع ہے[1]) لیکن نظام الاولیاء
کے تمام ملفوظات میں جو ملفوظ نسبتاً سب سے زیادہ مستند قرار پایا وہ فوائد الفواد
کے نام سے شیخ کے مرید با اختصاص میر حسن علاء سنجری کا جمع اور مرتب کیا ہوا ہے

[1] دسمبر ۱۹۳۲ء میں اس ملفوظ کا قلمی نسخہ معلومات سے لبریز سید علیم الدین مرحوم خادم آستانۂ نظامی کے پاس دیکھنے میں آیا تھا اور ان کی عنایت سے اسی وقت اس سے کچھ نوٹ بھی لے لئے گئے تھے

اہل دل کے نزدیک یہ کتاب گویا چشتیہ بہشتیہ کے نظام تصوف کا ایک مکمل دستور العمل ہے،

شیخ عبد الحق محدث دہلوی لکھتے ہیں۔

آں کتاب درمیان خلفا و مریدان شیخ نظام الدین دستور است (اخبار الاخیار) ص۹۶

یہ کتاب شیخ نظام الدین کے بجارین و مریدین کے درمیان بہ طور دستور العمل کے ہے،

اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں،

فوائد الفواد دستور العمل سلوک ست وبہ غایت خوب ہر چند خسرو ہم ملفوظ جمع کردہ، لیکن آنقدر مقبول نیست (ملفوظات شاہ عبد العزیز ص۳۷ طبع میرٹھ)

فوائد الفواد نہایت خوب ہے اور فن سلوک کا ایک دستور العمل خسرو نے بھی ملفوظات جمع کئے ہیں، لیکن ان کو یہ درجہ قبول حاصل نہیں،

کتاب فوائد الفواد نہایت معتبر است و آں وقت دستور العمل بود مگر دیگر ملفوظات مشتبہ ست غالب کہ بنا شد (ایضاً ص۸۱)

کتاب فوائد الفوائد ہر طرح معتبر ہے، اور اپنے زمانہ میں دستور العمل رہ چکی ہے، دوسرے ملفوظات بھی ہیں، مگر وہ مشتبہ ہیں،

اور یہ شہادتیں تو خیر بہت بعد کی ہیں، ایک معاصر عارف میر خورد کا اعتراف ملاحظہ ہو:۔

امروز آں فوائد الفوائد مقبول اہل دلانِ عالم شدہ است و دستور عاشقاں گشتہ و شرق و

فوائد الفواد اس وقت دنیا کے اہل دل طبقہ میں مقبول ہو چکی ہے اور عاشقانِ الٰہی کی دستور العمل

غرب عالم گرفتہ (سیر الاولیا) بن چکی ہے، مشرق و مغرب میں مشہور ہے، امیر خورد دہلوی صفحہ ۳۰۸ طبع دہلی)

خود امیر خسرو کی بابت منقول ہے، کہ رشک کے ٹھنڈے سانس کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ کاش میری تمام تصانیف حسن کے نام سے ہوتیں، اور یہ ایک میرے نام سے! (اخبار الاخیار، صفحہ ۹۸ سیر الاولیاء، صفحہ ۲۰۸) یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حسن نے اس ملفوظ کو مرتب کرنے کے بعد خود مرشد کی خدمت میں پیش کیا تھا، اور وہاں سے سند قبول پایہ اتہ پسند مل گیا تھا، (خزینۃ الاصفیاء، جلد اول صفحہ ۳۴۲)

حاصل ساری گفتگو کا یہ ہے کہ اہل سلوک کے حلقے میں فوائد گویا خود حضرت شیخ ہی کی کتاب ہے اور اس میں جو کچھ درج ہے وہ بس شیخ ہی کی تعلیمات ہیں، پیش نظر نسخہ، نولکشور پریس لکھنؤ کا مطبوعہ، متوسط تقطیع پر ۲۶۰ صفحہ کا ہے اور پانچ حصوں میں تقسیم ہے،

حصہ اول صفحہ ۱-۱۲ اس میں شعبان ۷۰۷ھ تا ذی الحجہ ۷۰۸ھ، ۳۴ مجالس کا ذکر ہے،

حصۂ دوم صفحہ ۴۱-۹۰ اس میں شوال ۷۰۹ھ تا شوال ۷۱۲ھ، ۳۸ مجالس کا تذکرہ ہے،

حصۂ سوم، صفحہ ۹۰-۱۱۳ اس میں ذیقعدہ ۷۱۲ھ تا ذی الحجہ ۷۱۳ھ، ۱۵ مجلسوں کا بیان،

حصۂ چہارم، صفحہ ۱۱۳-۲۱۷، اس میں محرم ۷۱۴ھ تا رجب ۷۱۹ھ، ۷۲ مجلسوں کے مذاکرے ہیں،

حصۂ پنجم ص ۲۱۸-۲۶۰، اس میں شعبان ۷۱۹ھ تا رجب ۷۳۲ھ، ۴۲ مجالس کے ارشادات جمع ہیں،

اس درمیانی وقفوں کے ساتھ، ۱۵ سال تک پھیلی ہوئی مدت کی کل ۱۷۹ مجلسوں اور صحبتوں کے ارشادات درج ہیں، اور یہ گفتگوئیں شیخ کے ابتدائی زمانہ کی نہیں آخری زمانہ کی ہیں، شروع اُس وقت ہوئی ہیں جب شیخؒ کی عمر ۷۰ سے متجاوز ہو چکی تھی اور ختم اس وقت ہوئی ہیں، جب شیخؒ کی وفات (ربیع الثانی ۷۲۵ھ) کو کل دو ڈھائی سال رہ گئے تھے،

کتاب خیال رہے کہ محض ملفوظ ہے، تقریروں اور لکچروں کا مجموعہ نہیں ارادتمندوں کے مختصر حلقہ میں شیخ کی زبان سے نکلے ہوئے حقائق و معارف، لطائف و نکات ہیں محتسب کی زد سے دور، قاضی شریعت کی گرفت سے باہر، اور پھر وقت اور مقام بھی کون؟ عہد رسالت سے سات سو سال کا بُعد، اور وہ وقت جب ہندی اسلام طرح طرح کی عجمی اور ہندی رنگ آمیزیوں کا معجون مرکب بن چکا تھا ——— اس حال میں اور اس ماحول میں خیال تو بیشک یہی قائم ہوتا ہے کہ پروا احکام شریعت کی کچھ بہت زیادہ نہ کی گئی ہوگی، اور عجب نہیں جو اس پرانے دین شریعت کے مقابلہ میں تھوڑے بہت ایک نئے آئین طریقت کی تلقین کی گئی ہو۔

ان شبہات کے ساتھ کتاب کھولئے تو نظر چند ہی سطروں کے بعد اس عبارت پر پڑتی ہے، اور پڑتے ہی جم جاتی ہے، کہ

سخن در تزکیہ افتاد، بر لفظ مبارک راند کہ کمال مرد در چہار چیز می شود قلۃ الطعام و قلۃ الکلام و	ایک روز تزکیہ نفس پر گفتگو تھی، ارشاد ہوا کہ کمال ان چار چیزوں سے پیدا ہوتا ہے کم کھانے سے، کم بولنے سے، کم ملنے

قلۃ الصحبۃ مع الانام وقلۃ المنام (کم جلنے سے اور کم سونے سے،

لیجئے۔ نہ یہ ارشاد ہوا کہ "عرس" خوب دھوم دھام سے کیا جائے، نہ یہ
کہ باجہ گاجہ کا زور ہو، نہ یہ کہ تربتوں پر چادروں اور مٹھائیوں کا ڈھیر لگا دیا جائے،
اور نہ یہ کہ مزارات کے غسالہ کو پیا جائے اور آنکھوں سے لگایا جائے، بلکہ سیدھی
سادی وہی باتیں بتا دیں جو اس سے قبل دنیا کے سب سے بڑے معلم و مرشد (علیہ الصلوٰۃ
والسلام) کے اتباع میں دوسرے ہادیانِ طریقت ہی بتا گئے تھے، یعنی وہی کم خوری
کم سخنی، کم آمیزی اور کم خوابی،

جامع ملفوظات نے کتاب کے شروع میں یہ قاعدہ رکھا ہے کہ ہر مجلس میں
جب جب اپنی حاضری کا ذکر کیا ہے، تو وقت حاضری بھی بتاتے گئے ہیں لیکن
وقت کی تعیین بجائے گھڑی اور پل کے، نماز کے حساب سے کرتے گئے ہیں، یعنی
قبل نماز یا بعدِ نماز گویا نظام الاولیاء کے نظام اوقات کا محور یا مرکز جو کچھ بھی
نماز ہی تھی، بعد کی مجلسوں میں اس تصریح کا التزام، غالباً غیر ضروری سمجھ کر
چھوڑ دیا ہے، لیکن ساری مجلسوں میں اتفاق سے اور کبھی کبھی نہیں بلکہ بار بار
اور کثرت سے جن چیزوں کا ذکر ملتا ہے وہ نماز اور روزہ ہیں، اور نوافل و
سنن اور قرآن اور تراویح! اور پھر احترام شریعت و اتباع سنت کی تاکید ملی

فقر و تصوف، شیخ کی نظر میں، نرے وجد و حال، ذوق و کیف کا نام نہ تھا،
بلکہ ظاہر و باطن دونوں کی آراستگی کا نام تھا، اس تصریح کے ساتھ کہ کچھ لوگ
ایسے ہوتے ہیں، جن کا ظاہر آراستہ ہوتا ہے، لیکن باطن خراب اور وہ متعبد
کہلاتے ہیں کہ گو طاعت بہت کرتے رہتے ہیں، لیکن دل اُن کا دنیا ہی میں پھنسا
رہتا ہے، اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جن کا ظاہر خراب ہوتا ہے، اور باطن آراستہ،
اور یہ مجذوب کہلاتے ہیں، کہ گو اُن کا دل حق سے اٹکا ہوتا ہے، تاہم یہ عمل سے

محروم ہیں، اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے ظاہر و باطن دونوں ہی خراب ہوتے ہیں، اور یہ عوام کالانعام ہوتے ہیں، شیخ فرماتے ہیں کہ ان تین طبقوں کے علاوہ چوتھا طبقہ و بعضے را ظاہر و باطن آراستہ ان کا ہوتا ہے جن کا ظاہر و باطن دونوں آراستہ ہوتے ہیں

وطائفہ کہ ہم ظاہر ایشاں آراستہ باشد وہم باطن آں مشائخ اند (صلا ۱۳۲)	جن کے ظاہر و باطن دونوں آراستہ ہوتے ہیں، یہی لوگ مشائخ (فقراء) ہیں

اہل طریق اتنا ہی نہیں کہ عموماً و عادتاً احکام شریعت کے پورے پابند رہتے ہیں بلکہ کسی حال میں بھی فرائض کو ترک نہیں ہونے دیتے، استغراق و تحیر کی ایک منزل ایسی آتی ہے کہ یہاں پہونچ کر اگر تکلیفات شرعی کے ساقط ہونے کا دعویٰ کیا جائے، تو عجب نہیں کہ چل جائے، لیکن نظام الاولیاء کی قوت ایمانی کو اتنی رعایت بھی گوارا نہیں، ایک بار مجلس میں ایسے متحیروں کا ذکر ہوا جو دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر رہتے ہیں، ایک صاحب نے اپنا مشاہدہ عرض کیا کہ فلاں مقام پر میں نے چند متحیروں کو دیکھا جو آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے برابر عالم حیرت میں رہا کرتے تھے، لیکن جب نماز کا وقت آتا تو ہوش میں آکر نماز پڑھ لیتے تھے، اور اس کے بعد پھر اسی عالم تحیر میں واپس پہونچ جاتے تھے، خواجہ نے اس کی تصدیق فرمائی اور ارشاد ہوا۔

ہمچنیں باشد کہ گفتی، اگرچہ شب و روز متحیر باشد اما نماز ایشاں فوت نہ شود، ازجہت ایں تحیر حکایت شیخ الاسلام حضرت قطب العالم خواجہ قطب الدین بختیار اوشی	بیشک ایسا ہی ہوگا جیسا تم نے بیان کیا، تحیر میں دن رات رہیں لیکن انکی نماز چھوٹنے نہیں پاتی، اس سلسلہ میں شیخ الاسلام حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کے تحیر کی

فرمودہ قدس سرہ کہ اورا ہمچنیں چہار شبانہ روز تحیر بود در وقت نقل (ص۱۴۴)

حکایت بیان فرمائی کہ وفات کے وقت مسلسل چار شب وروز اُن پر تحیر طاری رہا،

خواجہ قطب الدین بختیارؒ کے وصال کی حکایت عام طور پر مشہور ہے، یعنی محفل سماع برپا تھی، نوبت جب غزل کے اس شعر کی آئی، کہ

تشنگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

تو قطب عالم کی حالت متغیر ہونا شروع ہوئی، جب خانقاہ سے گھر لائے گئے تو مدہوش و متحیر تھے۔ بس یہی کہے جاتے تھے کہ ہاں اسی شعر کی تکرار کیے جاؤ ــــ آگے کا حال خود شیخ کی زبان سے سنئے :ــ

ہمیں بیت پیش او می گفتند او ہمچناں متحیر می بود، چوں وقت نماز در آمد نماز می گزارد و باز ہمیں بیت بگویانند، حالتے حیرتے پیدا می آمد چہار شبانہ روز ہم بریں حال بود، شب پنجم رحلت نمود (ص۱۴۴)

اسی شعر کی تکرار برابر انکے سامنے ہو رہی تھی، اور وہ اسی طرح مدہوش تھے، جب نماز کا وقت آتا نماز پڑھ لیتے اور پھر اسی شعر کی تکرار کرانے لگتے، اور حالِ حیرت کا عالم ان پر طاری ہو جاتا، چار شب وروز برابر یہ حالت رہی، پانچویں شب کو انتقال فرمایا،

اللہ اللہ! کس درجہ کا اہتمام اتباع شریعت کا تھا، یعنی مدہوشی میں بھی ادائے فرائض کا ہوش! ــــــــــ ایک مستی اور مدہوشی اس خواجہ چشت کی تھی کہ اپنے کھانے پینے، سونے جاگنے، اوڑھنے پہننے، زندگی بلکہ حیات زندگی کی طرف سے بےخبر، مدہوش و بےخبر، لیکن اللہ کے باندھے ہوئے فرض

کے لئے باہوش و باخبر! اور ایک مستی آج کے "مستوں" اور "قلندروں" کی ہے کہ اپنے ہر آرام و آرائش بلکہ لطف و لذت کا ہوش اور صرف اللہ کے باندھے ہوئے فرائض کے باب میں مدہوش و بےخبر!

شیخ جس وقت التفات و شفقت خاص فرماتے اُس وقت بھی تاکید طاعت و عبادت ہی کیا کرتے، جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ۱۵۔ شعبان ۱۳۰۰ھ کو جب حضوری نصیب ہوئی تو۔

بندہ راپیش طلبید، فرمود کہ باید کہ مشغول پیوستہ بہ طاعت و عبادت باشی و بہ اوراد و ادعیہ اگرچہ ہم مطالعۂ کتاب مشائخ باشد، مشغول باشی و بیکار نہ باشی (ص ۲۲)	بندہ کو اپنے پاس طلب فرمایا اور ارشاد کیا کہ ہمیشہ طاعت و عبادت میں اور اوراد و دعاؤں کے ذریعہ سے مشغول رہو، خواہ کتب مشائخ ہی کا مطالعہ ہو، بہرحال مشغول رہو، بیکار نہ رہو،

اسی طرح ۲۹ر جمادی الاُخریٰ ۱۳۰۱ھ کی مجلس کے تحت میں ذکر ہے، کہ سعادت قدمبوسی حاصل ہوئی، نماز جماعت کے فضائل کا تذکرہ ہوا، بندہ سے ارشاد ہوا کہ نماز باجماعت ہی پڑھنی چاہیئے، بندہ نے عرض کیا کہ مکان کے قریب مسجد تو ضرور ہے، لیکن مکان سے اٹھ کر اگر ہم وہاں جائیں تو گھر پر کوئی کاغذ، کتاب وغیرہ کی حفاظت کے لئے موجود نہیں رہتا، اس لئے مکان ہی پر جماعت کے ساتھ پڑھ لیتے ہیں، ارشاد ہوا کہ جماعت سے ضرور پڑھنا چاہیئے، اور بہتر یہی ہے کہ مسجد میں پڑھی جائے" (ص ۱۰۲) ۔۔۔۔

آج کتنے چشتی "مشائخ" کے ہاں نماز ہی سرے سے ضروری ہے! جماعت کی تاکید اور مسجد کی اہمیت کا ذکر ہی کیا!

ایک اور موقع پر حضرت سلطان المشائخؒ ایک بزرگ کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ اور اد و تسبیح، نماز و روزہ ان سب کی مثال دیگ کے مصالحہ کی ہے، اور دیگ کا گوشت ترک دنیا ہے، سو جس طرح محض نمک اور گھی اور مصالحہ ڈال دینے سے قورمہ نہیں تیار ہو سکتا، جب تک گوشت بھی نہ ملایا جائے، اسی طرح حب دنیا کے ترک کئے بغیر سارے اعمال بے نتیجہ ہیں، لیکن جس طرح گوشت اگر موجود ہے تو سب کچھ موجود ہے، اسی طرح ترک دنیا اگر موجود ہے، تو اہل طریق کے ہاں بجائے خود کافی ہے ——— آج سجادگی اور گدی نشینی کے لئے مقدمہ لڑنے والے پیرزادے اور نذر و نیاز اور چڑھاوے کے تقسیم کے لئے لاٹھیاں چلانے والے، فوجہ اربان کرڈالنے والے مشائخ زادے ایسے ملفوظ کے لئے کیا کہیں گے؟

لیکن خود ترکِ دنیا کا مفہوم بھی سمجھ لینا چاہیئے، ایسا نہ ہو کہ یہ جوگ اور رہبانیت کے مترادف قرار پا جائے، شیخ فرماتے ہیں۔

ترک دنیا آن نیست کہ کسے خود را برہنہ کند مثلاً لنگوٹہ بر بندد و بنشیند۔ ترک دنیا آن ست کہ لباس بپوشد و طعام بخورد، اما انچہ میرسد روا بدارد و بہ جمع او میل نہ کند و خاطر را متعلق چیزے نہ آورد ترک دنیا ست (ص۹)

ترک دنیا کے معنی یہ نہیں کہ انسان اپنا لباس اتار دے یا لنگوٹہ باندھ لے ترک دنیا کے معنی یہ ہیں کہ انسان لباس بھی پہنے اور کھانا بھی کھائے البتہ جو کماتا رہے، خرچ کرتا رہے، جوڑ جوڑ کر نہ رکھے اور دل کو کسی چیز میں اٹکائے نہ رکھے، یہ ترکِ دنیا ہے،

ان اوراق میں یہ بار بار آچکا ہے کہ طریقت، شریعت سے جدا نہ رہے

لیکن اس کی مخالفت ذرا سی نہیں، بلکہ شریعت ہی کے مغز یا عطر یا روح کا نام طریقت ہے، فقہاء نے شریعت کے ظاہری پہلو کو لے لیا، اور فقراء نے اپنی نظر باطنی پہلو پر جمائے رکھی، شیخؒ کے ملفوظات میں اس خیال کی تکرار ملتی ہے،

ایک روز شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی حکایت بیان فرمائی کہ آپ سیاحی کرتے ہوئے بدایوں وارد ہوئے اور یہاں قیام فرمایا، ایک روز قاضی شہر کے مکان پر ملنے گئے، خدمت گاروں نے کہا کہ ابھی قاضی صاحب نماز میں مشغول ہیں، شیخ نے تبسم کے ساتھ فرمایا، قاضی صاحب نماز پڑھنا جانتے بھی ہیں؟" دوسرے دن قاضی صاحب شیخ کی قیامگاہ پر آئے، اور بولے "کل آپ نے یہ کیسے کہہ دیا تھا کہ قاضی نماز پڑھنا جانتے بھی ہیں؟ میں تو مسائل و احکام نماز پر کتابیں لکھ چکا ہوں"۔ شیخ نے کہا "عالموں کی نماز دوسری ہوتی ہے، اور فقیروں کی دوسری"۔ قاضی صاحب بولے "کیا فقیر کوئی اور قرآن پڑھتے ہیں؟ یا رکوع اور سجدہ کسی نئے طریقہ پر کرتے ہیں"، شیخ نے فرمایا کہ عالموں کی نماز بس اسی قدر ہے کہ کعبہ کو نظر میں کرلیں، یا اگر دور ہیں تو جہت کعبہ کو، اور اگر اس کا بھی پتہ نہ چل سکا تو اندازہ سے جہت کعبہ کو تصور کر کے نماز شروع کر دی، لیکن درویشوں کی نماز یوں نہیں ہوتی، وہ جب تک عرش الٰہی پر نظر نہیں جما لیتے نماز نہیں شروع کرتے۔" (صفحہ ۲۳۸-۲۳۹)

آج کے بدعت نواز حال قال والے صوفیوں کو، وہ حضور قلب والی نہ سہی، ملّا جی صاحب والی ظاہری نماز بھی نصیب ہے؟

مدت سے ایک لفظ "عشق و محبت" کا گھڑ لیا گیا ہے، ترک عبادت، بلکہ ہر نافرمانی کو اسی پردہ میں چھپایا جاتا ہے، لیکن خود یہ محبت اور سچی محبت ہے؟

کیلئے؟ اس کا جواب عاشقوں کے اسی سردار کی زبان سے لیجئے، فرماتے ہیں:-

صدق محبت متابعت ست — سچی محبت پیروی ہی کا دوسرا نام ہے

اور پھر فرماتے ہیں کہ محبت کا نقشہ جم جانے کے بعد معصیت کی جرأت ہی کیسے باقی رہ سکتی ہے،

چوں کسے محب ایشاں شد ہر آئینہ متابعت ایشاں کند و از ناشایستہ دور باشد، چوں ایں چنیں شود ہر آئینہ گناہ نہ نویسند، آنگاہ فرمود کہ تا محبت حق در غلاف قلب باشد امکان معصیت ست اما چوں محبت در سویدائے قلب در آید پیش امکان معصیت نہ باشد (ص ۲۰۹)

جب کوئی اُن سے محبت کریگا تو یقیناً ان کی پیروی بھی کرے گا اور اعمال ناشایستہ سے دور رہے گا اور جب ایسا ہوگا تو لامحالہ اس کے گناہ بھی نہ لکھے جائیں گے، پھر ارشاد ہوا کہ محبت حق جب تک غلاف قلب میں ہے گناہ کا امکان باقی ہے، لیکن جب محبت سویدائے قلب میں گھر کر جاتی ہے تو معصیت کا امکان نہیں باقی رہتا (یعنی عاشق صادق سے نافرمانی ممکن کیونکر ہو؟

آج کتنے مدعیان "چشتیت" کا سارا ساز و سامان، ڈھول اور طنبورہ، ستار اور ہارمونیم کی نغمہ سرائیاں ہیں، اور قوالی کی محفلیں اگر نہ جمیں تو پھر درویشی اور خصوصاً چشتیت کا لطف ہی کیا رہا؟ لیکن ذرا شیخ کی آواز پر کان لگائیے، یہاں باجہ کے ساتھ سماع سرے سے جائز ہی نہ تھا،

کسے از حاضرین گفت کہ ہمدریں روزہا بعضے از درویشان آستانہ

حاضرین محفل میں سے ایک شخص نے کہا کہ ایک روز آستانہ مبارک کے

درویشے در مجمع کہ چنگ و رباب و مزامیر بود رقصہا کردند خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ نیکو نہ کردہ اند، آنچہ نامشروع ست ناپسندیدہ ست (صـ۲۲۷)

حاضر باش بعض درویش ایسے مجمع میں جس میں چنگ و رباب و مزامیر تھے، رقص کر رہے تھے، حضرت خواجہ نے فرمایا کہ بُرا کیا، جو شئے شرعاً ناجائز ہے، وہ بُری ہے۔

جب یہ درویش لوٹ کر آئے تو ان پر گرفت ہوئی کہ اس مجلس میں باجہ بھی تھا، تم نے سماع کیسے سنا؟ انھوں نے جواب میں عرض کیا کہ "ہم سماع میں اس قدر غرق و مست ہو گئے کہ ہمیں باجہ کے ہونے نہ ہونے کا پتہ ہی نہ چلا" حضرت خواجہ نے ارشاد فرمایا کہ "یہ جواب لغو ہے، وہ عمل معصیت ہی لکھا جائیگا" (صـ۲۲۷) ـــــ آج ہر قسم کی قوالی کے لئے سماع اکابرِ چشت کو آڑ بنا لینے والے خواجہ چشت کی یہ سختیاں اور زبردست جرحیں سُن رہے ہیں؟

ایک بار کا ذکر ہے، ایک شخص نے آکر خدمت والا میں عرض کی کہ فلاں مقام پر آپ کے مرید باجہ کے ساتھ سماع سُن رہے تھے، شیخ نے ناگواری کے ساتھ فرمایا، کہ "بیجا حرکت کی ہے، کہہ چکا ہوں کہ باجہ نہ ہو" پھر اُسی کی تاکید و تصریح میں فرمایا کہ "نماز اگر جماعت کے ساتھ ہو رہی ہو، اور جماعت میں عورتیں بھی شامل ہوں، اور نماز میں امام کو سہو ہوا ہو، تو مرد تو سبحان اللہ کہہ کر امام کو متنبہ کر سکتے ہیں، لیکن عورت اگر لقمہ دینا چاہے تو آواز سے نہ کہے، کہ آواز نامحرموں کے کان میں جائے گی، بلکہ صرف ہاتھ پر ہاتھ مار کر امام کو متوجہ کر دے اور اسمیں بھی یہ احتیاط رکھے کہ ہتھیلی ہتھیلی پر نہ مارے کہ یہ تالی بجانے کی سی شکل ہو گئی اور وہ لہو میں داخل ہے، بلکہ ہتھیلی کو دوسری ہتھیلی کی پشت پر مارے تو جب لہو کے درجہ کی چیزوں میں یہ احتیاط ہے کہ دستک تک کی اجازت نہیں، تو باجہ کیوں کر جائز ہو سکتا ہے، (صـ۹۵) ـــــ ڈھول اور طنبورہ والی

قوالیوں کی چوکیوں کے سرپرست "مشائخ" اب کیا فرمائیں گے؟

لوگوں نے کہیں سے سن پایا کہ شیخ سماع سنتے تھے، اور بس اسی کو مطلق صورت میں لئے پھرتے ہیں، شاید اس کی خبر ہی نہیں، کہ آپ کے ہاں قیدیں اور شرطیں کیسی کیسی کڑی لگی ہوئی ہیں،

گفت ہر گاہ کہ چند چیز جمع شود سماع آنگاہ شنود، و آں چند چیز چیست؟ مسمع و مسموع و مستمع و آلۂ سماع، آنگاہ ایں تقسیم را فائدہ فرمود و گفت کہ مسمع گوینده است او می باید کہ مرد باشد و مرد تمام بود، کودک نباشد و عورت نہ باشد، مسموع آنچہ می گویند، باید کہ ہزل و فحش نباشد مستمع آں کہ می شنود او ہم باید کہ بحق بہ شنود و مملو از یاد حق باشد آلت سماع چوں چنگ و رباب و امثال آں باید کہ درمیان نہ باشد ایں چنیں سماع حلال است (ف ۲۶۹)

فرماتے تھے کہ سماع اس وقت سنے جب یہ چند چیزیں اکٹھا ہو جائیں اور وہ چند چیزیں ہیں کیا؟ ایک مسمع دوسرے مسموع تیسرے مستمع، چوتھے آلہ سماع، پھر اس تقسیم کی شرح یوں فرمائی، مسمع سے مراد گانے والا ہے، اسے مرد بالغ ہونا چاہئے امرد اور عورت نہ ہو، مسموع سے مراد کلام ہے، کلام میں ہزل و فحش کی آمیزش نہ ہو، مستمع سے مراد سننے والا ہے، اسے چاہئے کہ اللہ کے لئے سنے اور اس کا دل یاد الٰہی سے لبریز ہو، اور آلۂ سماع مثل چنگ و رباب وغیرہ کے کچھ نہ ہو جب یہ شرائط جمع ہوں، جب جاکر سماع جائز ہوگا،

آج عرس کے کتنے مجمعوں اور قوالی کی کتنی محفلوں میں یہ شرطیں اور

قیدیں پوری نہ بھی آدھے درجہ میں بھی ملحوظ رہتی ہیں؟ کتنے سماع خانوں کی مجلسیں اس معیار پر پوری اُترتی ہیں؟ ______ لیکن اتنی شرطوں اور قیدوں والے سماع سے متعلق بھی ابھی قول فیصل سننا باقی ہے،

سماع صوتے ست وزاں چرا حرام باشد، دیگر تحریک قلب ست، اگر آں تحریک بریاد حق باشد مستحب ست واگر میل بفساد حرام بود، (صـ ۲۴۶)

سماع تو محض آواز موزوں کا نام ہے، محض اتنے کی حرمت کو کوئی وجہ نہیں، لیکن ساتھ ہی قلب کی بھی تو تحریک ہوتی ہے، سو اگر یہ تحریک اللہ کی یاد کی ہو جب تو مستحب ہے، لیکن اگر اس میں خرابی کا جزو ہو تو حرام ہے،

جس سماع چشتیہ کی اتنی دھوم تھی، اُس کی کل حقیقت آپ نے دیکھ لی؟ سب سے بڑی اور تاکیدی شرط یہ ہے کہ باجہ کسی قسم کا نہ ہو، تالیاں تک نہ بجنے پائیں، پھر گانے والے بالغ مرد ہوں[1]، عورتوں اور لڑکوں کے گانے کے جواز کی کوئی صورت ہی نہیں، پھر کلام بھی سرتاسر حقانی ہو، جذبات کو بھڑکانے والا نہ ہو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سننے والا تمامتر مرد حق ہو، جذبات نفسانی سے لذت لینے والا نہ ہو، یہ سب شرطیں اکٹھی ہو لیں، جب جاکر سماع درست ہوگا، صرف درست، واجب جب بھی نہیں، اور اگر شرطیں پوری نہ ہوئیں، تو حرام! باجہ ہوا تو حرام، سننے والے ہیں، سنانے والے

---

[1] پیشہ ور گویوں اور قوالوں کی کوئی گنجایش نہیں، محفل نظامی کے قوال تو امیر خسرو یا امیر حسن جیسے لوگ تھے! کوئی مناسبت [illegible] سے فسق پیشہ قوالوں کو ہے؟

میں کلام میں، کہیں سے فسق کا دخل ہو گیا تو حرام! ______ آج کی چودھویں صدی والا تصوف، پہلی صدی ہجری کے مطابق نہ سہی، کاش اسی آٹھویں صدی ہجری کے ہندی تصوف ہی کے معیار کا ہوتا!

---

(۷) منطق الطیر[1]

(از شیخ فرید الدین عطارؒ)

(الف) مصنفؒ

مسلم و مستند کتب تصوف میں ایک بڑا حصہ کلام نظم کا ہے، نثر پر گفتگو ہو چکی، اب نظم کا سرسری جائزہ لینا ہے، پہلے نمبر پہ حضرت عطارؒ ہیں، جن کا نام حکیم سنائیؒ کے ساتھ ساتھ زبانوں پہ آتا ہے،

اسم مبارک محمد بن ابی بکر ابراہیم، کنیت ابو حامد یا ابو طالب، لقب فرید الدین، تخلص عطار، عام زبانوں پر اسم مشہور فرید الدین عطار،

ولادت مضافات نیشاپور میں ہوئی، مزار بھی وہیں ہے،

سنہ ولادت ۵۱۳ھ، سال وفات میں اختلاف ہے، نفحات الانس کی روایت کے مطابق ۶۲۷ھ، عمر کے بہت طویل ہونے پر سب تذکرے متفق ہیں، سبب وفات بھی سب کو مسلم ہے، یعنی تاتاریوں کے ہاتھ سے جام شہادت نوش فرمایا۔

ابتداء میں ایک بڑے دواخانہ کے مالک تھے، ایک روز اپنے کاروبار میں

---

[1] ماخذ:- (۱) نفحات الانس (جامی) (۲) تذکرہ ہفت اقلیم (امین رازی) (۳) تذکرۃ الشعراء (دولت شاہ سمرقندی) (۴) مفتاح التواریخ (ولیم ٹامس بیل)

تھے کہ ایک فقیر نے آکر صدا لگائی، کہ اللہ کے نام پر کچھ دلاؤ، یہ کچھ خبر نہ ہوئے، اس نے صدا پر صدا لگائی اور جب دیکھا کہ کچھ اثر نہیں ہوتا تو بولا ایسے دھندے میں لگے ہوئے ہو، تو جان کیسے دوگے؟ یہ جھنجلا کر بولے "جیسے تم دوگے" فقیر نے کہا بھلا میری طرح کیا دوگے؟" یہ کہا اور سر کے نیچے کشکول رکھ کر لیٹ گیا، زبان سے لا الہ الا اللہ کہا اور روح پرواز کر گئی، شیخ کے قلب پر بڑا اثر پڑا دواخانہ کھڑے کھڑے لٹا دیا اور خود اُسی وقت سے درویشی اختیار کرلی،

پہلے شیخ رکن الدین اسکاف کی خدمت میں کئی سال بسر کئے، پھر سفر زیارت بیت اللہ کو نکلے، اور بہت سے مشایخ کی خدمت میں رہے، بالآخر شیخ مجد الدین بغدادی کے ہاتھ پر بیعت کی، اور آگے چل کر سلوک وعرفان کے وہ مراتب طے کئے کہ خود مرشد کے لئے باعث فخر ہوئے،

جلالت قدر کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے، کہ مولانائے روم کے کلیات میں شیخ کا نام گویا مقتدا و پیشوا کی حیثیت سے آیا ہے، اور ان کی عظمت کا بار بار اعتراف ہے، مثلاً ؎

گرد عطار گشت مولانا شربت از دست شمس بود نوش

یا ایک اور غزل میں ؎

عطار روح بود وسنائی دو چشم او ما در پے سنائی و عطار آمدیم

یا ایک اور موقع پر ؎

ہفت شہر عشق را عطار گشت ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

اسی تعظیم واحترام کے ساتھ مثنوی میں بھی جا بجا نام لیا ہے، اور ان کے اشعار کو اپنے کلام میں ضم کیا ہے،

اور ملا جامیؒ لکھتے ہیں،

آں قدر اسرار توحید و حقائق اذواق	توحید کے جتنے اسرار و نکات اور
و مواجید کہ در مثنویات و غزلیات	وجد و حال کے جتنے لطائف و حقائق
وے اندراج یافتہ در سخناں ہیچ ازیں	عطار کی مثنویوں اور غزلوں میں ملتے
طائفہ یافتہ نمی شود جزاہ اللہ سبحانہٗ	ہیں اتنے طبقۂ صوفیہ میں اور کسی کے
عن الطالبین المشتاقین خیر الجزاء	ہاں نہیں ملتے، اللہ انکو تمام طالبین
(نفحات ص ۶۹۸)	عاشقین کی طرف سے بہترین جزا
	عنایت کرے،

نظم و نثر میں تصنیفات بڑی کثرت سے چھوڑی ہیں، بعض روایتوں کے مطابق تو اُن کی تعداد قرآنی سورتوں کے ہم عدد یعنی ۱۱۴ ہے، قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں یہی روایت اختیار کی ہے، چنانچہ کہتے ہیں ؏

ہماں خریطہ کش دارئے فنا عطار	کہ نظم اوست شفا بخش عاشقان حزیں
مقابل عدد سورۂ کلام نوشت	سفینہائے عزیز و کتابہائے گزیں

اس تعداد کی صحت کا علم تو عالم مطلق ہی کو ہے، البتہ ذیل کی کتابیں مستند کہی جاسکتی ہیں، اور ان میں سے بعض تو بہت مشہور بھی ہیں،

(۱) تذکرۃ الاولیاء، ۲ جلد (نثر میں قدمائے صوفیہ کا مفصل تذکرہ)

(۲) منطق الطیر - (اسی پر تبصرہ آگے آتا ہے)

(۳) مصیبت نامہ (۴) اسرار نامہ (۵) الٰہی نامہ (۶) دیوان (۷) جیسر نامہ (۸) پند نامہ (۹) وصیت نامہ (۱۰) خسرو و گل (۱۱) شرح القلب،

شیخ کی جانب منسوب ایک کتاب لسان الغیب کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم (لندن) میں موجود ہے، لیکن اس کے جو اشعار مصنف کی شیعیت کے ثبوت میں پیش کئے گئے ہیں، وہ خود اس امر کی دلیل ہیں کہ یہ کتاب شیخ کی نہیں، شیخ کا اہل سنت

ہونا اپنی جگہ پر ثابت ہے، اور یہ کلام کسی اہل سنت کا نہیں ہو سکتا،

مزاج میں خاکساری اور فروتنی جس درجہ کی تھی، اس کی شہادت تذکرۃ الاولیا کے دیباچہ کی سطر سطر دے رہی ہے، اپنے کو سب سے زیادہ حقیر و ناچیز سمجھتے تھے، اور شاید یہ اسی انکسار و تواضع ہی کی مقبولیت کا ثمرہ ہے کہ آج ان کا نام سر آمد عاشقاں و سرتاج عارفاں کی حیثیت سے زندہ و روشن ہے!

شہادت کا واقعہ تذکروں میں یوں درج ہے کہ تاتاریوں کے عین ہنگامہ میں ایک سپاہی نے شیخ کو گرفتار کیا، ایک راہگیر نے بڑھ کر کہا کہ "دیکھنا، اس پیر مرد کو قتل نہ کر دینا، دس ہزار اشرفیاں نقد دیتا ہوں کہ ان کو چھوڑ دو۔" شیخ نے کہا "خبردار، اتنے پر مجھے فروخت نہ کر دینا، میں اس سے کہیں زیادہ قیمت رکھتا ہوں" سپاہی خوش ہوا کہ دولت اس سے بھی بڑھ کر ہاتھ آئے گی، آگے بڑھے ایک اور شخص ملا، اس نے کہا کہ میاں سپاہی اس بوڑھے کو مجھے دے ڈالو، میں ایک گٹھا گھاس کا اس کے معاوضہ میں دیتا ہوں،، شیخ بولے، ہاں دے ڈال، کہ میری قیمت اس سے بھی کم ہے" سپاہی کے تن بدن میں آگ لگ گئی، کہ دس ہزار اشرفیاں سلتی ہوئی ہاتھ سے گئیں، جھلا کر وہیں معاً سر تن سے جدا کر ڈالا! واللہ اعلم،

(ب) تصنیف

قدماء ہی کے دور آخر میں بنیاد معارف روحانی و حقائق عرفانی کو نظم میں ادا کرنے کی پڑ چکی تھی، متوسطین نے اسے معراج کمال پر پہونچایا، سنائی، مغربی عراقی، نظامی، ابو سعید ابوالخیر خسرو، جامی، یہ سب اسی بحر کے شناور رہے اور مولانا رومی نے تو گویا زبان شعر کو الہامی بنا دیا! عطار بھی اسی جماعت کے ایک ممتاز و مقتدر رکن ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ یہ رند سرمست جب میکدۂ شعر میں قدم رکھتا ہے تو

جبہ و دستار کا احترام کس حد تک ملحوظ رکھتا ہے،

تذکرۃ الاولیار کے بعد شیخ کی مقبول ترین تصنیف یہی منطق الطیر ہے، اس کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ مولانائے روم کی شہرۂ آفاق مثنوی معنوی کا نقش اول یہی مثنوی ثابت ہوئی، یعنی تذکروں میں یہ روایت صراحت کے ساتھ درج ہے کہ مولانا کے التفات خاص کے مورد جب حسام الدین چلپی ہوئے تو ایک روز انھوں نے عرض کی کہ حضرت غزلیات کا مجموعہ بہت ہو چکا، اب کچھ توجہ مثنوی پر ہو، اور شیخ عطار کی منطق الطیر کی طرز پر کوئی مسلسل نظم ارشاد فرمائی جائے، ادھر فرمائش پر عمل فرمائش سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا۔

مثنوی معنوی اور منطق الطیر کا وزن ایک ہے، موضوع ایک ہے، اور افسانوں سے اخلاق و معرفت کے درس حاصل کرنے کا اسلوب ایک ہے، مولانا نے عطار کا حق تقدم اپنی مثنوی میں جابجا تسلیم کیا ہے، اور جابجا ان کے اشعار کو اپنے کلام میں ضم کرتے گئے ہیں،

مضامین کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ حمد و نعت و منقبت خلفائے اربعہ کے بعد اصل قصہ کا آغاز ہے، افسانہ کے اشخاص (یا آج کی زبان میں کردار) بجائے انسانوں کے چند پرندے فرض کئے ہیں، ہدہد، طوطی، مرغ، فاختہ، قمری، بلبل، باز وغیرہا، ایک روز یہ سب پرندے یکجا ہوتے ہیں، اور اپنا بادشاہ منتخب کرنا چاہتے ہیں، ہدہد سیمرغ کا نام پیش کرتا ہے، اس پر دوسرے پرندے معترض ہوتے ہیں، ہدہد ایک ایک کا اعتراض سنتا اور الگ الگ سب کو جواب دیتا ہے، آخر اس پیامبر حق و عرفاں (ہدہد) کی تبلیغ و تفہیم سے تمام طیور شاہ شاہان سیمرغ کے حلقۂ اطاعت و انقیاد میں آجاتے ہیں ——— سوالات وہی ہیں جو عموماً ہر طالب سالک کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، اور ان کے جوابات ہی جادۂ سلوک و طریقت

کے مختلف مقامات ہیں،

لفظ منطق الطیر قرآن مجید ہی کی ایک آیت سے ماخوذ ہے، وورث سلیمان داود قال یاایہاالناس علمنا منطق الطیر واوتینا من کل شیٔ (نمل، ع) ہدہد طیور سلیمان میں فہم ودانش میں سب سے ممتاز تھا، اس لئے شیخ نے طریقت کے حقائق و معارف اسی کی زبان سے ادا کرائے ہیں،

حمد بہت مفصل لکھی ہے، سب سے زیادہ زور بندہ کی بیچارگی، بے علمی و درماندگی پر ہے،

لیب بدوز از عرش وز کرسی مپرس	گرچہ یک ذرہ ہمی پرسی مپرس
عقل تو چوں در سر موے بسوخت	ہر دو لب باید ز پرسیدن بدوخت
کس نہ داند کنہ یک ذرہ تمام	چند گویم کس نہ داند والسلام (ص۲)

اسمائے الہیٰ "حکیم" و "لطیف" کی تجلیات حیرت انگیز ہیں، عقل بشری حوادث فطرت کو دیکھ کر دنگ رہ رہ جاتی ہے، انبیائے کرام تک کو عجیب و غریب حالات میں رکھا گیا ہے ؎

سوئے کنہ خویش کس را راہ نیست	ذرہ از ذرہ آگاہ نیست
در نگر اول کہ با آدمؑ چہ رفت	عمرہا او دریں عالم چہ رفت
باز بنگر نوح در غرقاب کار	تا چہ بردار کافراں سال ہزار

یعقوبؑ کی سرگردانی و گریہ وزاری، یوسفؑ کی غلامی و اسیری، ایوب کی ستم کشی و برداشت مصائب، یہ چند نمونے ہیں باقی تقریباً تمام انبیاء کی زندگی طلسم ساز فطرت کی انہی کرشمہ زائیوں کا ایک مسلسل منظر ہے، اور تو اور خود سرور انبیاء تک کی حیات طیبہ اسی قسم کے خوارق فطرت سے لبریز ہے ؎

عنکبوتے را بہ حکمت دام داد	صدر عالم را در و آرام داد (ص۷)

معرفت باری کی صورت صرف یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو اس ہستیِ مطلق میں گم کردے،،

تو مباش اصلا کمال این ست وبس — تو درو گم شو وصال این ست وبس

تو درو گم شو حلولے ایں بود — ہرچہ آں نبود فضولے آں بود (ص۳۰)

اُس تک رسائی کا راستہ صرف یہ ہے کہ اپنی بے بسی، عجز کا اعتراف کیا جائے بجائے خدا سے ڈرنے کے خود اپنے سے ڈرا جائے، اور بارگاہ ارحم الراحمین میں بہ تضرع و الحاح مناجات کی جائے، کہ وہ اپنے درد محبت کا ایک ذرہ ہی عنایت کردے،

خلق ترسد از تو من ترسم زخود — کز تو نیکی دیدہ ام وز خویش بد

لوگ تو تجھ سے ڈرتے ہیں لیکن میں اپنے ہی سے ڈرتا ہوں، اس لئے کہ تجھ سے تجربہ تو بھلائی کا ہوا ہے اور اپنے سے تجربہ برائی کا،

. . . .

اے بفضلت ناشدہ نامید کس — حلقۂ داغ توام جاوید بس

تیرے فضل و رحمت سے آج تک کوئی مایوس نہیں ہوا ہے، تیری ہی غلامی کا داغ میرے لئے ہمیشہ کو کافی ہے،

ہر کرا خوش نیست دل بر درد تو — خوش مبادا انکہ بنود مرد تو

جو دل تیرے درد سے لطف لینے والا نہیں، وہ نالائق کسی خوشی کے قابل ہی نہیں،

ذرہ دردم دہ اے درمان من — زانکہ بے دردت بمیرد جان من

اے میرے طبیب درد محبت کا ایک ذرہ عنایت کر، کہ تیرے درد محبت کا نہ ہونا تو میری جان کی موت ہے،

کفر کافر را و دیں دیندار را　　ذرۂ دردت دل عطار را (ص۱۳)

کافر کو کفر مبارک رہے اور دیندار کو دین اور عطار کو تیرے درد کا ایک شمہ!

نعت گوئی شیخ عطارؔ کا خاص جوہر ہے، کہنا چاہئے کہ اس صنف سخن کے مالک ہیں، اخلاص و نیاز کا رنگ لفظ لفظ سے پھوٹا پڑتا ہے ؎

خواجۂ دنیا و دیں گنج وفا　　صدر و بدر ہر دو عالم مصطفےٰ

آفتاب شرع و دریائے یقیں　　نور عالم رحمۃ للعالمیں

خواجۂ کونین سلطانِ ہمہ　　آفتاب جان و ایمان ہمہ

پیشوائے ایں جہاں وآں جہاں　　مقتدائے آشکار و در نہاں

خواجۂ کنہ ہرچہ گویم بیش بود　　وز ہمہ چیز از ہمہ در پیش بود

آفرینش را جز او مقصود نیست　　پاکدامن تر از و موجود نیست

عقل را در خلوت او راہ نیست　　علم نیز از وقت او آگاہ نیست

رفت موسیٰ بر بساطِ آنجناب　　خلع نعلیں آمدش از حق عتاب

باز در معراج شمعِ ذوالجلال　　می شنید آواز نعلینِ بلال

موسیٰ عمراں چوں آں دولت بدید　　چاکر او را چنیں قدرت بدید

گفت یارب امت او کن مرا　　در طفیل ہمت او کن مرا (ص۱۵-۱۷)

حضرات انبیاؑ کے درمیان تفاضل امتی کو زیب نہیں دیتا، بلکہ ایک حد کے آگے تو قطعاً ناجائز ہے، لیکن اگر انھیں حدود تک رہے تو شاید چنداں مضائقہ ہی نہ ہو۔

آگے مناقب خلفاء اربعہ کا بیان ہے، بعض حلقوں میں عطارؒ کو امامیہ مشہور کرنے کی جو عجیب کوشش ہوئی تھیں، اور اس کی تائید میں جو لغو اشعار ان کی جانب منسوب کیئے گئے ہیں، ذرا اس کو پیش نظر رکھ کر ذیل کی مدحِ صحابہ سننے کے

قابل ہے، ابتداء "افضل البشر بعد از انبیاء" سے ہوتی ہے ؎

خواجہ اول کہ اول یار اوست ثانی اثنین اذہما فی الغار اوست

صدر دیں صدیق اعظم قطب حق در ہمہ چیز از ہمہ بردہ سبق

ہرچہ حق از بارگاہِ کبریا ریخت در صدر شریعت مصطفیٰ

آں ہمہ در سینۂ صدیق ریخت لاجرم تا بود از تحقیق ریخت

فاروق اعظم رض کی جلالتِ قدر کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے،

خواجۂ شرع آفتاب شرع دیں ظلِ حق فاروق اعظم رض شمع دیں

ختم کردہ عدل و انصافش بحق تا فراست بردہ بر جنس سبق

آنکہ دارد بر صراط اول گذر ہست او از قول پیغمبر عمر رض (دستہ ۲۴)

ذوالنورین کی فضیلت مراتب پر روشنی ڈالنے کے لئے اشعار ذیل کافی ہیں ؎

خواجۂ سنت کہ نور مطلق است بل خدا را نور او نور بر حق ست

آنکہ غرق قدس فرقاں آمدست صدر دیں عثمان رض عفاں آمدست

رونقے کاں عرصۂ کونین یافت از دل پر نور ذوالنورین یافت

یوسف ثانی بہ قول مصطفیٰ بحر تقوی و حیا کان وفا

اہل سنت کا عقیدۂ صحیح ناقص و ناتمام رہ جائے گا اگر حضرت علی مرتضیٰ رض کے حضور میں عقیدت کا گلدستہ نہ پیش کیا گیا ہوتا

خواجۂ حق پیشوائے راستیں کوہ حلم و بحر علم و قطب دیں

ساقی کوثر امام رہنمائے ابن عم مصطفیٰ شیر خدائے

مرتضیٰ و مجتبیٰ زوج بتول خواجۂ معصوم داماد رسول

مقتدائے دین بہ استحقاق اوست مفتی مطلق علی الاطلاق اوست

اس کے بعد شرح و بسط کے ساتھ کئی ورق اس موضوع کی نذر کئے ہیں کہ

جو لوگ خلفائے ثلثہ سے تعصب رکھتے ہیں، وہ خود علی مرتضیٰؓ کی تعلیم وہدایت کے مخالف بلکہ دشمن ہیں اور اس قول کی تائید میں آپ کی سیرت مبارک سے کئی واقعات نقل کئے ہیں،

ہدہد یا پیغمبر حق تمام طیور جمع ہونے پر انھیں دعوت دیتا ہے کہ سب اپنے کو سلطان مطلق کی حکومت و انقیاد میں لے آئیں اور یہ مرتبہ سلطانی حق سیمرغ کا ہے، ساتھ ہی وہ اس سیمرغ کے اوصاف بھی بیان کرتا ہے، ان صفات پر نظر کرنے سے سمجھ میں خود آجائے گا کہ سیمرغ سے کنایہ کس ذات عالی کا ہے اور افسانہ کے پردہ میں کن حقائق و معارف کی تلقین ہو رہی ہے،

نام او سیمرغ سلطان طیور — او بما نزدیک و ما زو دور دور
صد ہزاراں پردہ دارد بیشتر — ہم ز نور وہم ز ظلمت بیشتر
در دو عالم نیست کس را زہرہ — کو تواند یافت از وے بہرہ
دائما او بادشاہ مطلق ست — در کمال عز خود مستغرق ست
نے بر ذرہ نے شکیبائی از وست — صد ہزاراں خلق سودائی از وست
ہیچ دانائے کمال او ندید — ہیچ بینائے جمال او ندید (ص ۳۸)

یعنی وہ ہم سب کا بادشاہ ہم سب سے متصل ہے، ہم ہی البتہ اس سے بیگانہ ہیں، وہ لاکھوں پردوں میں ہے، اور اس کا وجود نور وظلمت دونوں سے قبل سے ہے، کائنات میں کسی کی مجال نہیں کہ وہ اس سے ہمسری کا دعوا کر سکے، وہ سب کا ازلی و ابدی بادشاہ مطلق ہر وقت اپنے شان کمال میں غرق ہے، ہزارہا مخلوق اس غم میں پریشان ہے، کہ نہ اس تک رسائی کی راہ ملتی ہے، اور نہ اس کی طرف سے صبر کرکے بیٹھ جانا ممکن ہے، نہ کوئی عقل اس کے کمال کو آج تک پہنچ سکی ہے، نہ کوئی آنکھ اس کے جمال سے مشرف ہو سکی ہے،

باقی ساری کتاب اسی حقیقت الحقائق، اسی ذات علی الاطلاق، اسی ہستی وراء الوراء کی توصیف اور اس تک رسائی کی تدبیر اور منازل سفر کی تفصیل کی نذر ہے۔
چند مضامین و مطالب بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں، یہی انداز ساری کتاب کا ہے،

راہ طلب و سلوک میں سب سے بڑا رہزن نفس کا شوق جاہ و ترفع ہے، انسان بڑی بڑی ریاضتیں گوارا کر لیتا ہے، سخت سے سخت مجاہدے جھیل لے جاتا ہے، کہ خلق میں اُس کے زہد و عبادت کی شہرت ہو جائے، حالانکہ یہی حُب جاہ اس سفر میں سخت ترین سنگ گراں ہے، شیخ شبلی ایک مرتبہ لوگوں کی نظر سے غائب ہو گئے بڑی تلاش کے بعد مخنثوں (زنانوں) کے ایک گروہ کے درمیان بیٹھے ہوئے ملے آنکھیں تر اور ہونٹ خشک، کسی نے حیرت کے ساتھ سوال کیا، آپ نے جواب دیا کہ جیسے یہ لوگ نہ عورت ہیں نہ مرد، میں بھی راہ دین میں نہ مرد ہوں نہ عورت، بد اعمالیوں کی کثرت سے میری زندگی خود میرے لئے باعث شرم ہے، ——— عارف کو چاہیئے کہ اسی طرح اپنے کو ذلیل و خوار رکھے، ۔ہ

ہمچو مردان ذل خود کن اختیار	گردہ بر استادگاں عزت نثار
گر تو پیش آئی زموئے در نظر	خویشتن را از بتے سازی بتر
مدح و ذمت گر تفاوت میکند	بتگرے باشد کہ او بت می کند
گر تو حق را بندۂ، بتگر مباش	در تو مردانہ دہی، آذر مباش
نیست ممکن درمیان خاص و عام	از مقام بندگی برتر مقام
چوں ترا صد بت بود در زیر دلق	چوں نمائی خویش را صوفی بہ خلق
اے مخنث جامہ مرداں مدار	خویش را زیں بیش سر گرداں مدار ص۱۰۱

ایک مرتبہ قاضی شہر کے پاس دو صاحب اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرانے آئے،

دونوں لباس اور ظاہر سے صوفی بنے ہوئے۔ قاضی انھیں تنہائی میں لے گئے اور بڑی غیرت دلائی کہ "جسم پر لباس تو برترک و تسلیم کا، اور دل بدستور من و تو کے جھگڑے میں اٹکا ہوا، اگر دل ترک پر آمادہ نہیں، تو یہ لباس ہی پہننا کیا ضرور تھا۔ "میں تزکیۂ باطن کا دعویٰ نہیں رکھتا، محض مقدمات چکتا ہوں، لیکن میں اس لباس سے شرمایا جاتا ہوں"۔ ——— یہ درویشی تو تمامتر ترک تعلق کا سودا ہے،

دو مرقع پوش در دار القضا | در خصومت آمدند و در جفا
گفت صوفی خوش نباشد جنگ باز | قاضی ایشاں را بہ کنجے برد باز
ایں خصومت از چہ در سر کردہ اید | جامۂ تسلیم در بر کردہ اید
ایں لباس از تن بیفکند از میان | گر شما ہستید اہل جنگ و کیں
در خصومت از سر جہل آمدید | در شما ایں جامہ را اہل آمدید
زیں مرقع شرم میدارم قوی | منکہ قاضی ام نہ مرد معنوی
سر دہی بر باد ترک جاں کنی | گر بہ دعویٰ عزم ایں میداں کنی (صفحہ ۱۰۲)

نفس کی شقاوت کی کوئی حد نہیں، انسان کی نظر سے دردانگیز و عبرتناک واقعات کیسے کیسے ہر روز گزرتے رہتے ہیں، پھر بھی اسے عبرت حاصل ہوتی ہے نہ نصیحت، کسی نے ایک مسن گورکن سے سوال کیا، کہ "تمھاری تو عمر قبر کھودنے میں گزری ہے بتاؤ کیا کیا عجائبات نظر سے گذرے" جواب ملا کہ سب سے بڑا عجوبہ یہ ہے کہ ستر سال گورکنی کرتے ہوئے ہوئے اور اپنا نفس ایک لمحہ کیلئے بھی مردہ نہ ہوا، ع

سائلش گفتہ کہ چیزے گوے باز | یافت مردے گورکن عمرے دراز
چہ عجائب دیدۂ در زیر خاک | تا چو عمرے گور کندی در مغاک

مثلاً سنائی اور نادر وجبار کے مقدمہ بالا قسم کے شارح نے یہ حکایت نقل کی ہے۔

گفت ایں دیدم عجائب جب حال | کیں سگ نفسم زہی ہفتاد سال
گردن کردن دید یک ساعت نمرد | یک زماں فرمان دیک طاعت نبرد

سب سے زیادہ زہر دینے کے قابل علائق دنیوی کا ترک ہے، حب دنیا حیات ایمانی کے حق میں زہر ہے، سہ

حب دنیا ذوق ایمانت ببرد | آرزوئیش پہ تو جانت ببرد
چیست دنیا آشنائے حرص و آز | اندہ از فرعون و نمرود باز
کار دنیا چیست؟ بیکاری ہمہ | چیست بیکاری؟ گرفتاری ہمہ
ہست دنیا آتشی افروختہ | ہر زماں خلقے دگر را سوختہ (ص۱۰۹)

ایک مرتبہ حضرت عیسیٰؑ کھری زمین پر استراحت فرما رہے تھے اور سر کے نیچے ایک چھوٹی سی اینٹ تکیہ کے طور پر رکھ لی تھی، آنکھ کھلی تو دیکھتے ہیں، کہ ابلیس پاس ہی کھڑا ہے، فرمایا، ملعون، تیرا یہاں کیا کام ہے؟" اس نے جواب دیا "یہ اینٹ میری ملک ہے، ساری دنیا ہی میری ملک ہے، اور یہ اینٹ بھی اسی کا ایک جزو ہے، آپ اس کو اپنے کام میں لائے، تو آپ نے خود ہی مجھ سے توسّل پیدا کیا حضرت نے یہ سنتے ہی اینٹ پھینک دی اور دوبارہ استراحت کو لیٹے، ابلیس بولا "اب بیشک آرام کیجئے، اب میرا یہاں ٹھہرنے کا کوئی کام نہیں رہا" (ص۱۰۸-۱۱۹)

ایک صاحب نے بعد نماز دعا کی کہ "کارساز عالم! میرے حال پر رحم کر" ایک دل جلا جل کر بولا "تم اور طلب رحمت! ہمہ وقت تو اپنی خود پرستیوں میں مست ہو، مکان ہے تو عالی شان، در و دیوار ہیں تو زرنگار، کام کاج کے لئے غلاموں کی کھیپ کے کھیپ کے محتاج، کنیزوں کی ضرورت اس پر مستزاد، خود گرفتہ میں یہ اٹھا، کہ ذرا اہتمام، اور اس پر نزول رحمت کی توقع و طلب؟ اگر دانشی تجھ

باری کی تمنا ہے تو پہلے اپنے کو غیر سے تو فارغ البال کرو ـــــــ
وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا ؎

تو ز ناز خود نہ گنجی در جہاں	می خرامی از تکبر ہر زماں
منظرے سر بر فلک افراشتہ	چار دیوارش بزر بنگاشتہ
دہ غلام و دہ کنیزک کردہ راست	رحمت آنجا کے بود بر گوے راست
نیک بنگر تا تو با ایں جملہ کار	جائے رحمت داری آخر شرم دار
روئے اکنوں می بہ گرداں از ہمہ	تا شوی فارغ چو مرداں از ہمہ ص۱۹

مومن کو رحمت الہیٰ کی طرف سے مایوس کبھی نہ ہو جانا چاہیئے، گناہ کیسے ہی اور کتنے بھی ہوں، بہر حال رحمٰن و رحیم کی رحمت ان سے وسیع تر ہے، یاس تو صرف کافروں کا حصہ ہے، مومن کو چاہیئے کہ ہر حال میں اس کی رحمت پر بھروسہ رکھے اور اپنی طرف سے توبہ میں مشغول رہے،

اس مفہوم کو مختلف پیرایہ میں بار بار ادا کیا ہے، مثلاً کہیں یوں ؎

تو یقیں می داں کہ صد عالم گناہ	از تف یک توبہ برخیزد زراہ
بحر احساں چوں درآید موج زن	محو گرداند گناہ مرد و زن

اور کہیں یوں ؎

گر نبودے مرد را توبہ قبول	کے بدے ہرگز رائے او ز دل
گر گنہ کردی در توبہ ست باز	توبہ کن کیں در نخواہد شد فراز
گر بہ صدق آئی در یں رہ یکدمے	صد فتوحت پیش آید ہر دمے (ص۱۶۲)

اصل شے اخلاص و صدق نیت ہے، حد یہ ہے کہ اگر شرک بھی اخلاص کے ساتھ ہے تو عالم الغیب والشہادۃ کی بارگاہ سے بالآخر ہدایت نصیب ہو کر رہے گی، شیخ حکایت لکھتے ہیں کہ ایک شب حضرت جبرئیل اپنے مقام

قرب میں تھے کہ حضرت قدس سے صدا لبیک کی سنائی دی، سمجھے کہ کوئی خاص مقبول بندہ اس وقت ذکر وعبادت میں مصروف ہے، اور اس کی پذیرائی ہو رہی ہے، جی میں آئی کہ اس کا پتہ لگائیے، دم بھر میں ہفت افلاک کا چکر لگا ڈالا، اس کا پتہ نہ چلا کرۂ زمین کا رخ کیا، اس کا کونہ کونہ چھان ڈالا، پتہ پھر بھی نہ چلا اپنے مقام پر واپس آئے، دیکھا کہ حضرت قدس سے صدائے لبیک برابر چلی آرہی ہے، تلاش از سر نو شروع کی، اور اب کی بھی ناکام رہے، عاجز آکر بارگاہ اعلیٰ میں عرض کی، حکم ہوا ملک روم میں جاکر دیکھو، آکر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بت کے آگے اس کی عبادت ہو رہی ہے، دنگ وحیران ہو کر عرض کی، یہ آخر کیا راز ہے کہ صریح بت پرستی پر یہ رحمت"! جواب سنئے ؎

حق تعالیٰ گفت ہست او دل سیاہ

زاں نمی داند غلط کر دست راہ	وہ نادانی سے غلط راہ پر پڑ لیا ہے
از نیازش خوش ہمی آید مرا	تو کیا ہوا ہم تو اس کے خلوص قلب کو
زیں نشان دادن ہمی باید مرا	دیکھ رہے ہیں وہ اسوقت گمراہ ہے
گر ز عجلت رہ غلط کرد آں سقط	تو ہوا کرے ہم ابھی اس کے خلوص نیت
منکہ می دانم نہ کردم رہ غلط	کا انعام یہ دیتے ہیں کہ وہ راہ
ہم کنوں راہیش ہم تا پیش گاہ	راست پر آیا جاتا ہے۔ (ص ۹۷)

لطف او خواہد شد او را عذر خواہ

چنانچہ ؎

ایں بگفت و راہ جانش بر کشاد	معاً اس کا قلب روشن کر دیا گیا،
در خدا گفتن زبانش بر کشاد	کشود کار کے مرتبے آناً فاناً طے
	کرا دیئے گئے اور مشرک و بت پرست

بات کہتے کہتے موحد و خدا پرست
ہو گیا،

شیخ کے نظام عمل میں سب سے بلند و مقدم مرتبہ، احکام الٰہی کے اتباع کا ہے، ایک مرغ (زبان تمثیل میں روح) کی زبان سے سوال ہوتا ہے کہ

دیگرے پرسید از دکہ رہنمائے
چوں بود گر مر امی آمدم بجائے
من نہ دارم با قبول ورد کار
می کشم فرمان او در انتظار

تعمیل ارشاد اور فرماں برداری کے باب میں کیا ارشاد ہے؟ مجھے اختیار و انکار سے سروکار نہیں، میں تو محض اتباع امر کرنا چاہتا ہوں۔

(ہدہد پیغمبر حق) کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ

گفت نیکو کردی اے مرغک سوال
مرد راازیں بیشتر بنود کمال
کے بری جاں گر تو آنجا جاں بری
جاں بری گر تو بہ جاں فرمانبری
ہر کہ فرماں بر داز خذلاں برست
از ہمہ دشوار ہا آساں برست
طاعتے با امر گر یک ساعت است
بہتر از بے امر عمر طاعت است

اس سے بلند تر کوئی بھی مرتبہ نہیں یہ مرتبہ اور سارے مرتبوں سے اعلیٰ و افضل ہے، تعمیل امر میں ایک ساعت کی بھی طاعت ساری عمر کی طاعت گذاریوں اور مجاہدوں سے بہتر ہے جو اپنی مرضی اور رائے سے کیے جائیں،

(صفحہ ۱۳۹)

انسان بندہ ہے، اس کا کمال یہی ہے کہ بندگی میں کمال پیدا کر دکھائے،

بندگی ایں باشد نہ دیگر چوں کسی
تو خدائی می کنی نے بندگی

بندگی انگندگی ہے، ہیچ کس کے شود ممکن ترا انگندگی

مقبولیت اور برگزیدگی کا دعویٰ آسان ہے، لیکن اس دعویٰ پر دلیل بھی کمالِ عبودیت و افگندگی ہے ؎

بندہ آں نبود کہ از رئے گزاف | می زند در بندگی پیوستہ لاف
بندۂ وقت امتحاں آید پدید | امتحاں کن تا نشاں آید پدید

کتاب اوّل سے آخر تک تمام ہو گئی، کہیں ذکر ثانوی بلکہ ضمنی حیثیت سے بھی نہ دھوم دھام والے عرسوں کا آیا اور نہ پُرشکوہ قوالیوں نہ مزار کی چادروں کا، نہ قبے اور گنبد کا، اور نہ بیسیوں دوسرے گڑھے ہوئے رسوم صوفیہ کا۔

---

(۸) لوائحؒ

(ملّا نورالدین عبدالرحمٰن جامیؒ)

(الف) مصنّف

ملا جامیؒ کا زمانۂ وفات نویں صدی ہجری کے اختتام کا ہے، اس لئے انھیں دور متوسطین کی آخری یادگار کہہ سکتے ہیں، یہ وہ زمانہ ہے کہ تصوف ایک مستقل نظام کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، اور اسلام کی سادہ تعلیم میں فلسفہ اور غیر مذہب کی آمیزش اچھی طرح ہو چکی تھی،

اسم گرامی قول مشہور کے مطابق نورالدین عبدالرحمٰن تھا، سفینۃ الاولیاء کی روایت ہے کہ اصل نام عماد الدین تھا، مشہور نام نورالدین ہو گیا، والد کا نام ایک روایت میں احمد بن محمد دشتی آیا ہے، دوسری میں نظام الدین احمد دشتی، دشت اصفہان کے ایک محلہ کا نام ہے،

ولادت قصبۂ جام میں ہوئی، کچھ اس مناسبت سے، اور کچھ اس لحاظ سے بھی کہ شیخ الاسلام احمد جام کی عقیدت کا جام نوش فرمایا تھا، اپنا تخلص جامیؔ قرار دیا، خود فرماتے ہیں:۔

---

[1] ماخذ:۔ (۱) نفحات الانس (جامی) (۲) سفینۃ الاولیاء (داراشکوہ) (۳) مفتاح التواریخ (مسٹر بیل)

مولدم جام و رشحۂ قلمم — جرعۂ جام شیخ اسلامی ست
لاجرم در جریدۂ اشعار — بدو معنی تخلصم جامی ست

تخلص اس قدر مقبول ہوا کہ لوگ نام بھول گئے، عام زبانوں پہ صرف جامی یا مُلّا جامی رہ گیا،

تاریخ ولادت بالاتفاق ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ (۷ نومبر ۱۴۱۴ء) ہے اور تاریخ وفات بہ روایت قوی ۱۸ محرم ۸۹۸ھ (۹ نومبر ۱۴۹۲ء) ہے، ایک ضعیف روایت ۱۵۰۱ء سے متعلق بھی ہے، وفات شہر ہرات میں ہوئی،

بیعت سلسلۂ نقشبندیہ میں مولانا سعد الدین کاشغری سے تھی، بچپن میں پانچ سال کے بھی سن سے پہلے، خواجہ محمد پارسا نقشبندی کی زیارت سے مشرف ہوئے، طریق روحانیت کی تخم ریزی قلب میں اسی وقت سے ہوگئی، ۶۵ سال کی عمر میں جب نفحات الانس کی تالیف میں مشغول ہوئے ہیں، اس واقعہ کا تذکرہ اس انداز سے کرتے ہیں، کہ قلم سے گویا سیاہی کے بجائے عقیدت کے قطرے ٹپک رہے ہیں، ۸۲۲ھ تھا کہ آخر جمادی الاول یا آغاز جمادی الآخر میں خواجہ موصوف جام سے گذر رہے تھے، خلقت گروہ در گروہ نذر و اخلاص و عقیدت پیش کرنے حاضر ہو رہی تھی، ملا جامی کے والد ماجد نے اس خورد سال بچہ کو خواجہ کی پالکی میں لاکر بٹھادیا، خواجہ نے التفات خاص فرمایا، اور ایک سیر مصری عنایت کی، اس سرگذشت کو قلمبند کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

"امروز آں شصت سال است کہ ہنوز صفائی طلعت منور ایشاں در دلِ من و ہمانا کہ رابطۂ اخلاص و اعتقاد و ارادت و محبتے کہ ایں فقیر را نسبت بہ خاندان خواجگان قدس اللہ تعالیٰ ارواحہم واقع

لہ یہ تاریخیں حسب بیان اِن سائکلو پیڈیا آف اسلام (جلد دوم) ہیں۔

ست بو برکت ایشاں بودہ باشد وامید می دارم کہ بو مین ہیں رابطہ
درزمرۂ محباں و مخلصان ایشاں محشور گردم (نفحات صفحہ ۴۴۹-۵۰ ۴)

مگر سب سے زیادہ ارتباط و اختصاص شاید خواجہ عبید اللہ احرار کے ساتھ تھا اُن کا تذکرہ نفحات اور اپنی دوسری کتابوں میں کمال عقیدت و تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

علوم ظاہری کی تعلیم ہرات میں پائی، استادوں میں نام ملا جنید، خواجہ علی سمرقندی و قاضی روم سمرقندی کے ملتے ہیں، طالب علمی کے زمانہ میں بڑے ذہین اور بڑے قوی الحافظہ تھے، ذکاوت، جودت ذہن، قوت حافظہ، ان سب کے عجیب وغریب واقعات تذکروں میں ملتے ہیں، شوخ وظریف بھی تھے۔ اس کا ثبوت آج تک بہارستان کے صفحات دے رہے ہیں۔

"حضرت مولانا را نہم طبعے کہ بود بالاتر از آں من باشد وبسیار خوش خلق و خوش تکلم وشگفتہ بودند ومطایبہائے لطیف می فرمودند" (سفینۃ الاولیاء)

تصانیف کی تعداد لفظ جام کے ہم عدد، ۴۴ ہے، مشہور یہ ہیں:۔
یوسف و زلیخا، تحفۃ الاحرار، سبحۃ الابرار، نفحات الانس، شواہد النبوۃ، لوائح، بہارستان، شرح کافیہ اور کلیات،

مرید سلسلہ نقشبندیہ میں تھے، لیکن طبیعت پر ذوق و وجد چشتیہ کا سا غالب تھا، "ہمیشہ در ذوق و وجد می بودہ اند" (سفینہ) اور شاید اسی لئے سماع سے بھی محترز نہ تھے،

مثنوی، غزل، قصیدہ وغیرہ نظم کی ہر صنف پر قادر تھے، اور مدح تشبیب، معرفت، توحید، وغیرہ ہر مضمون کے مالک تھے، سب سے بڑھا چڑھا رنگ

نعت کا تھا۔ اس جوش و خروش کی نعتیں فارسی میں کمتر کسی کی ملیں گی،

مرتبۂ کمال کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خود ان کے مرشد فرمایا کرتے تھے کہ "شہباز ہمارے جنگل میں آ پھنسا ہے"۔ (سفینہ) خواجہ عبید اللہ احرار اتنی تعظیم کرتے کہ اپنے خطوط کو لفظ "عرضداشت" سے تعبیر کرتے اور اکثر فرماتے تھے کہ "خراسان میں تو آفتاب موجود ہے، لوگ اُسے چھوڑ کر ماوراء النہر کے چراغ (یعنی میرے پاس) کیوں آتے ہیں"۔ گویا ملا جامی کو آفتاب ٹھہراتے اور اپنے کو چراغ،

احوال و کرامات کے اخفا میں خاص اہتمام تھا، جہاں تک بس چلتا کسی پر اپنے مرتبۂ کمال کو نہ ظاہر ہونے دیتے، باانیہمہ مرجع خلائق تھے،

"مقبول عالم و مقتدائے ماوراء النہر و خراساں و پیشوائے زماں بودہ اند و سلطان حسن بایقرا بکمال عقیدت و نیازمندی بخدمت ایشاں بود۔" (سفینہ)

سلطان اور امراء کی عقیدتمندیوں کے مرکز تھے،

"در عہد سلطان ابو سعید بہ خدا شناسی و خدا پرستی شہرت یافتہ مقبول خاص و عام گشت، و در عہد سلطان حسن بایقرا بیشتر از بیشتر قبول یافت و امیر علی شیر غاشیۂ انقیاد او بر دوش جاں می داشت۔" (مفتاح التواریخ)

خانہ کعبہ کی زیارت کو گئے، تو آمد و رفت دونوں موقعوں پر قبول عام نے قدم قدم پر استقبال کیا، ایک مرتبہ دمشق میں مقیم تھے کہ سلطان روم کا قاصد پانچ ہزار اشرفیوں کی نذر لئے ہوئے، اس درخواست کے ساتھ پہونچا کہ قسطنطنیہ بھی تشریف قدوم سے مشرف ہو جائے، مولانا قاصد سلطانی کی آمد کی خبر پا کر قاصد کے در ورود سے قبل ہی تبریز چل کھڑے ہوئے تھے، یہاں حاکم

کردستان حسن بیگ کی نیاز مندیاں زنجیر پا ہونے لگیں، بہ مشکل تمام اجازت لے کر خراسان پہونچے۔ یہاں پہونچے تو یہاں بھی نذرانوں کے انبار نے خیر مقدم کیا،

(ب) تصنیف

لائحہ" کے لفظی معنی شعاع درخشاں کے ہیں، مجازی معنی تختۂ عمل یا روزنامچہ کے ہیں، لوائح اس کی جمع ہے، لوائح جامی چند لائحوں کا مجموعہ ہے، کل تعداد نسخہ نولکشوری کے مطابق ۴۳ ہے، اور نسخہ لندنی کے مطابق اس سے کم، قدماء فن کی تصانیف کی طرح سلوک کے علم و عمل پر یہ کوئی جامع و مبسوط رسالہ نہیں، بلکہ صرف فلسفۂ تصوف سے متعلق چند لطائف و اشارات کا مجموعہ ہے، زمانۂ تالیف وہ ہو، کہ یونانی مشرکوں کے فلسفہ کو مسلمانوں میں رائج ہوئے کئی سو سال ہو چکے ہیں، اور اشراقیت، ومشائیت، تناسخ وحلول، عقل کل اور ہیولیٰ اور اسی طرح کے خاک بلا، کیسے کیسے عقائد و اوہام، یونانی، مصری، ہندی، ایرانی فلسفہ نجوم اور جوگ کے اثر سے اسلامی مدرسوں اور خانقاہوں میں داخل ہو چکے ہیں، اور خود مسلمانوں کے اندر شیخ الاشراق، ارطوسی، اور فارابی اور ابن سینا اور ابن رشد جیسے "معقولی" بڑی تعداد میں پیدا ہو چکے ہیں، اور ان کے خرافات توحید کے خاندان کے گھر گھر پھیل چکے ہیں،

اسلامی تصوف اب قرآن وسنت پر عمل کا نام نہ تھا، جنید و ذوالنون کا تصوف صحابۂ کرام کی تقلید تھی، ان کے عقائد و اعمال ابوبکر و علیؓ کے عقائد و اعمال تھے، اب دور وہ تھا کہ ہر چیز "عقلی بن چکی تھی، شیخ ابن عربی اور ان کے شاگردوں کے طفیل میں سلوک بھی ایک" فلسفہ "تھا، اور اس کے خاص خاص نظریات

تھے، اور بڑے بڑوں کی خانقاہیں اور تکیے اب ایسے ایسے عقائد اور اعمال کے گہوارے بن چکے تھے، جن سے صحابہ وتابعین کے دور میں کوئی واقف نہ تھا، ملا جامی اسی فضا میں آنکھیں کھولتے ہیں، اسی ہوا میں سانس لیتے ہیں، اسی غذا سے نشوونما حاصل کرتے ہیں، اور اس کے بعد اپنے قلم کو گردش دیتے ہیں، شیخ ابن عربیؒ کے رنگ میں رنگے ہوئے ان کے فلسفہ وحدت الوجود میں ڈوبے ہوئے، اس پر بھی جب قدم اٹھاتے ہیں تو جادۂ شریعت سے باہر نہیں پڑنے دیتے، ساری کتاب میں بس ایک مسئلہ توحید باری اور اسی کے متعلقات کو مختلف پیرایوں میں مختلف تعبیروں کے ساتھ ادا کرتے ہیں، اور بدعات مشائخ میں سے کسی ایک کے بھی ذکر کی ہمت نہیں پاتے، موضوع نہایت نازک و متین ہے، انداز بیان اتنا مؤثر ہے کہ پڑھنے والے پر ایک ہنگامی کیفیت تو فنائیت کی طاری ہو کر رہتی ہے،

آغاز کلام میں زبان قلم یوں زمزمہ سنج ہوتی ہے:۔

"خداوندا، سپاس تو بزبان نمی آریم و ستایش تو بر تو نمی شماریم، ہر چہ از صحائف کائنات از جنس اثنیہ و محامدست ہمہ بہ جناب عظمت و کبریائی تو عایدست، از دست و زبان ما چہ آید کہ سپاس و ستایش ترا شاید تو چنانی کہ خود گفتہ و گوہر ثنائے تو آن ست کہ خود سفتہ ؎

آنجا کہ کمال کبریائے تو بود	عالم نمے از بحر عطائے تو بود
مارا چہ حد حمد و ثنائے تو بود	ہم حمد و ثنائے تو سزائے تو بود

مناجات اور طلب توفیق میں متعدد رباعیاں لکھی ہیں، مثلاً ؎

(۱) یارب دل پاک و جان آگاہم دہ	آہ شب و گریۂ سحرگاہم دہ
روئے دل من صرف کن از ہر جہتے	آنگہ بخود زخود بخود راہم دہ

(۲) یارب همه خلق را به من بدخو کن — از جملهٔ جهانیاں مرا یکسو کن
روے دل من صرف کن از هر جهتے — از عشق خودم یکجهت و یکرو کن

تمہید اور مطلب و اغراض تالیف کے ذیل میں فرماتے ہیں:-

این رساله ایست مسمیٰ به لوائح در میان معارف و معانی که بر الواح اسرار و ارواح ارباب عرفان و اصحاب ذوق و وجدان لائح گشته به مجاهدات لائقه و اشارات رائقه متوقع که وجود متصدی این بیان را در میان نه بینند و بر بساط اعتراض و سماط اعتراض نشینند، چه او را درین گفتگو نصیبے جز منصب ترجمانی نے، و بهرهٔ غیر از شیوهٔ سخن رانی نے ۵

اس رسالہ کا نام لوائح ہے، اس میں ان معانی و معارف کا بیان ہے جو ارباب عرفان و اصحاب ذوق و وجدان کے قلوب، و ارواح پر روشن ہوئے، اور جنھیں یہاں الفاظ مناسب و اشارات دلکش کے ساتھ قلمبند کیا گیا، امید ہے کہ پڑھنے والے یہاں بیانات کے شارح کی شخصیت کا خیال درمیان میں نہ لائیں گے اور اعتراض و نکتہ چینی سے محترز رہیں گے، اسلئے کہ مصنف کا منصب اس کتاب میں محض ترجمانی کا ہے، اسکی حیثیت ایک حوالہ سے زائد مطلق نہیں ۵

من هیچم و کم ز هیچ هم بسیارے
از هیچ و کم از هیچ نیاید کارے
هر سر که ز اسرار حقیقت گویم
ز انم نه بود بهره بجز گفتارے

میں ہیچ بلکہ ہیچ سے بھی بہت کم ہوں ایسے ہیچ اور کمتر از ہیچ سے ہو ہی کیا سکتا ہے، یہ جو اسرار حقیقت میں بیان کر رہا ہوں انکا صرف ناقل و ترجمان ہی ہوں اس سے زائد کچھ نہیں

اب لوائح کے لائحے شروع ہوتے ہیں،

(۱) لائحہ اول، اس بیان میں ہے کہ عالم و مافی العالم سے قطع نظر کر کے
خدائے دو جہاں آفریں ہی کی طرف بہ کمال یکسوئی متوجہ رہنا چاہیے،

ماجعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ، حضرت بیچون کہ ترا نعمت
ہستی دادہ است در درون تو جز یک دل ننہادہ ست تا در محبت او یک رو
باشی و یک دل، و از غیر او معرض و برو مقبل، نہ آنکہ یک دل را صد پارہ کنی و ہر پارہ
در پے مقصدے آوارہ سے

اے آنکہ بہ قبلۂ بتاں دوست ترا — بر مغز چرا حجاب شد پوست ترا
دل در پے این و آں نہ نیکوست ترا — یک دل داری بس ست یک دوست ترا

(۲) لائحہ دوم، اس حقیقت کے بیان میں ہے کہ مخلوق سے دل لگانا ہی طبیعت
میں پراگندگی و انتشار کا باعث ہوتا ہے، اور اگر وہ صرف خالق واحد ہی سے
لگی رہے، تو جمعیت خاطر و یکسوئی بھی تمامتر میسر رہے،

"تفرقہ عبارت ازاں ست کہ دل را بہ واسطۂ تعلق بامور متعددہ
پراگندہ سازی، و جمعیت آنکہ از ہمہ بہ مشاہدہ واحد پردازی، جمعے گمان
بردند کہ جمعیت در جمع اسباب است در تفرقہ ابد ماندند و فرقہ بہ یقین
دانستند کہ جمع اسباب تفرقہ ست از ہمہ افشاندند، سے

اے سالک رہ سخن ز ہر باب مگوے — جز راہ وصول رب ارباب مپوے
چوں علت تفرقہ ست اسباب جہاں — جمعیت دل ز جمع اسباب مجوے

(۳) لائحہ سوم کی تعلیم یہ ہے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے اور ظاہر و باطن ہر حال میں نگراں،

زہے خسارت کہ تو دیدہ از — پس کیسے افسوس کی بات ہے کہ
لقائے او بر داشتہ سوے دیگر — تو اسکے دیدار کو چھوڑ کر دوسرے دل کی

می نگرے وطریق رضائے او
بگذاشتہ راہ دیگرمی سپری ؎

جانب نظر رکھتا ہے اور اس کی
خوشنودی کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرے
کی راہ طے کر رہا ہے ؎

بایار بہ گلزار شدم رہگزری
برگل نظرے فگندم از بیخبری
دلدار بطعنہ گفت شرمت بادا
رخسار من ایں ست تو در گل نگری

جب وہ عاشق) ایکدن محبوب کیساتھ گلشن کو گیا
اور وہاں اپنی حماقت سے پھولوں کو دیکھنے لگا
اس نے چڑھکر کہا شرم نہیں آتی کہ میرے رخسار کے
ہوتے ہوئے آپ نگاہ پھولوں پر دوڑا رہے ہیں

(۴) لائحہ چہارم کا حاصل ہے، کہ ماسوائے حق جو کچھ ہے، زوال پذیر و فانی ہی، باقی صرف ذات حق ہو، اسکے سوا ساری امیدیں اور آرزوئیں لغو وموہوم ہیں،

(۵) لائحہ پنجم، کائنات کی ساری جلوہ آرائیاں اسی جمیل مطلق کا پرتو ہیں، دنیا میں اگر کوئی دانا ہے، تو اس پر اسی کی ذات کا پرتو ہے، اگر کوئی بینا ہے تو اسی کے عکس کی تجلی ہے، غرض دنیا میں جتنے بھی کمالات و اوصاف سمجھے جاتے ہیں سب اسی کے مظاہر و اظلال ہیں اور اسی کل اور مطلق نے اوج کلیت و اطلاق سے تنزل کر کے اپنی تجلیات کو جزئیت و تقید میں رونما کیا،

(۶) لائحہ ششم میں انسان کی حقیقت بیان کی ہے کہ

آدمی اگرچہ بہ سبب جسمانیت
در غایت کثافت ست امابہ
حسب روحانیت در نہایت
لطافت، بہرچہ روئے آرد
حکم آں گیرد، وبہرچہ توجہ
کند رنگ آں سبر برد، پس

آدمی اپنی جسمانیت کے لحاظ سے
غایت کثافت میں ہے، لیکن اس
طرح بہ اعتبار روحانیت
انتہائے لطافت میں اب وہ
جس طرف بھی توجہ کرے گا وہی
رنگ اس پر چھا جائے گا، تو لے

می باید کہ بہ کوشی و خود را
از نظر خود بپوشی، و بر ذاتی
اقبال کنی و بہ حقیقی اشتغال نمائی
کہ درجات موجودات ہمہ بجالی
جمال اوینند و مراتب کائنات
مرائی کمال او و بریں نسبت چنداں
مداومت نمائی کہ باجان تو درآمیزد
و ہستی تو از نظر تو برخیزد اگر خود
روے آوری روے بہ او آوردہ
باشی چوں از خود تعبیر کنی تعبیر از
وے کردہ باشی مقید مطلق شود
و انا الحق ہو الحق،

طالب تجھے لازم ہے کہ تو اپنے
کو اپنے سے مخفی کر، اور جو ہستی
ذاتی و حقیقی ہے، بس اسی کی جانب
مشغول و متوجہ ہو جا، اس لئے کہ
موجودات کی جتنی بھی قسمیں ہیں
سب اسی کے جمال کی تجلیات ہیں
اور کائنات کے جتنے بھی اجزاء
ہیں، سب اسی کے کمال کا آئینہ،
تو اپنی اس نسبت کو مشق و ریاضت
سے اس درجہ تک پہونچادے کہ وہ
ہستی حقیقی تجھ تک مدغم ہو جائے
اور خود تیری ہستی میری نظروں سے
غائب ہو جائے، یہاں تک کہ تو
اگر اپنا خیال کرے تو عین اسی کا
خیال کرے، اگر تو اپنا ذکر کرے
تو عین اسی کا ذکر کرے اور اس
طرح مقید مطلق ہو جائے اور انا الحق
ہو الحق کے حکم میں داخل ہو جائے،

(۷) لائحہ ہفتم سے عملی طریقوں کی تعلیم شروع ہوتی ہے، اس لائحہ میں تعلیم یہ ہے کہ ذکر الہٰی اور نسبت حق سے کوئی حالت خالی اور وقت کا کوئی لمحہ ضائع نہ گذرنا چاہیئے۔

"ورزش ایں نسبت شریفہ می باید کرد بروجہے کہ ہیچ وقت از اوقات در ہیچ حالتے از حالات ازاں نسبت خالی نہ باشی چہ در آمدن وچہ در خوردن وخفتن وچہ در شہیدن وخفتن وبالجملہ در جمیع حرکات وسکنات ما فراغت می باید بودتا بہ بطالت نہ گذرد۔"

(۸) لائحہ ہشتم، جس طرح وقت کو تمامتر ذکر الٰہی سے مشغول و معمور رکھنا چاہیے اسی طرح قلب کو بھی کوشش کر کے تعلقات دنیوی سے منقطع کر لینا چاہیے۔

(۹) لائحہ نہم، اس میں فنا اور فنائے فنا کی تعریف بیان کی ہے،

فنا عبارت ازاں ست کہ بواسطۂ استیلائے ظہور ہستی حق بر باطن بماسوائے او شعور نماند وفنائے فنا آنکہ بآں بے شعوری ہم شعور نماند وپوشیدہ نہ باشد کہ فنائے فنا مندرج است زیرا کہ صاحب فنا را اگر بہ فنائے خود شعور باید، صاحب فنا نہ باشد بہ جہت آنکہ صفت وموصوف آں از قبیل ماسوائے حق اند سبحانہ وتعالیٰ پس شعور بآں منافی فنا باشد۔"

(۱۰) لائحہ دہم، توحید کی تعریف بیان کی ہے،

توحید یگانہ گردانیدن دل ست	وہ ماسوائے حق سے دل کے ہر قسم
یعنی تخلیص وتجرید از تعلق بماسوائے	اور ہر نوعیت کے ترک تعلق اور قطع
حق ہم از روئے طلب وارادت	وابستگی کا نام ہے، اور وہ طلب وارادت
وہم از جہت علم ومعرفت،	علم ومعرفت سب پر شامل ہے،

(۱۱) لائحہ یازدہم، کا حاصل ہے کہ انسان پر نفس کی خواہشیں جس وقت غالب ہیں، اس نسبت مع اللہ کو ہر وقت ملحوظ رکھنا لازمی ہے، جوں جوں علائق کی بیڑیاں پیر سے کٹتی جائیں گی، مجاہدوں اور ریاضتوں میں لطف آنے لگے۔

(۱۲) لائحۂ دوازدہم کا خلاصہ یہ ہے کہ مجاہدات میں جوں جوں لذت جاتی گی انسان اس نسبت، مع اللہ کی تربیت و تقویت میں طبعاً زیادہ مصروف ہوتا جائے گا،

(۱۳) لائحۂ سیزدہم حقیقت حق تعالیٰ میں ہے:۔

حقیقت حق سبحانہ و تعالیٰ جز ہستی نیست و ہستی اورا اختلاط دیستی نے۔ مقدس از سمت تغیر و تبدل و مبرا است از سمت تکثر و تحول۔ از ہمہ نشانہا بے نشان نہ در علم گنجد و نہ در عیان	حق تعالیٰ کی حقیقت تمامتر اس کی ہستی ہے، ایسی ہستی جس میں کسی ہستی کی گنجائش نہیں، نہ اس میں تغیر و تبدل کا امکان ہے نہ تعدد و تکثر کا گمان، سارے حدود و قیود سے بالاتر، عقل و حواس اور ان کی اسے اپنی گرفت میں لانے سے معذور

(۱۴) لائحۂ چہاردہم، لفظ وجود کے معنی بیان کئے ہیں،
ایک، تحقق اور حصول، اور یہ حکماء و متکلمین کی اصطلاح ہے،
دوسرے، حقیقت قائم بالذات، یہ اہل عرفان و صوفیہ کی اصطلاح ہے اور اس معنی میں یہ لفظ ذات حق کے مرادف ہے،

(۱۵) لائحۂ پانزدہم، معنی صفات کی تحقیق میں ہے، صفات ایک معنی میں غیر ذات ہیں اور ایک معنی میں عین ذات،

صفات غیر ذات اند من حیثیت مایفہم العقول، و عین ذات اند من حیث التحقق و الحصول مثلاً عالم ذات است بہ اعتبار	عقلی تحلیل میں، تو صفات بیشک ذات سے الگ ہیں، لیکن بلحاظ تحقق وحصول کے لحاظ سے تو عین ذات ہیں مثلاً عالم اس ذات کا نام ہے

صفت علم و قادر بہ اعتبار قدرت
و مرید بہ اعتبار ارادت و شک
نیست کہ اینہا چنانکہ بہ حسب
مفہوم با یکدیگر متغائر اند
مر ذات را نیز متغائر اند اما بہ
حسب تحقق بہ حسب تحقق و ہستی
عین ذات کہ اند کہ آنجا
وجود ذات متعدد نیست بلکہ
وجود وجہت واحد،

جس میں صفت علم ہو، قادر
اس ذات کا جس میں صفت
قدرت ہو، مرید اس ذات کا
جس میں صفت ارادہ ہو، اور
یہ یقینی ہے کہ جس طرح یہ صفات
باہم متغائر ہیں، اسی طرح ذات
سے بھی الگ ہیں، لیکن ان کا
تحقق تو عین ذات ہی میں ہے،
اس سے باہر ان کا وجود ہی نہیں،

(۱۶) لائحہ شانزدہم میں اس حقیقت کی ترجمانی ہے، کہ ذات بحیثیت ذات تمام اسماء و صفات و اضافات سے معریٰ ہے، لیکن اپنے ظہور و شہود میں ان سب سے متصف ہوتی جاتی ہے، اور جوں جوں تجلیات میں کثرت پیدا ہوتی جاتی ہے، یہ اتصاف بھی بڑھتا جاتا ہے،

(۱۷) لائحہ ہفتدہم، یہ لائحہ بہت مفصل ہے، اس میں مراتب تعینات اور ذات واحد کے غنائے مطلق پر دقیق پیرایہ میں گفتگو ہے، خاتمہ کے چند شعر سننے کے قابل ہیں ؎

(۱) دامان غنائے عشق آمد پاک — ز آلودگی نیاز باشتی خاک
چوں جلوہ گر و نظارہ گر جملہ خود است — گر ما و تو درمیاں نباشیم چہ باک

(۲) واجب ز وجود نیک بد مستغنی ست — واحد ز مراتب عدد مستغنی ست
در خود ہمہ را بچو جاودان می بیند — از دید فشان برون ز خود مستغنی ست

(۱۸) لائحہ ہیژدہم، ہر نوع حیوانی کے افراد کے تشخصات اور تعینات کو الگ کرکے

اگر دیکھا جائے، تو افراد کے لئے اسم مشترک اسی نوع حیوانی کا نکلے گا، پھر اب جتنی انواع حیوانی ہیں، ان کے ممیزات کو دور کیا جائے، تو اب اسم مشترک "حیوان" رہے گا، اب جو انات اور اجسام خاص کے دوسرے انواع کے ممیزات کو اگر حذف کیا جائے، تو حقیقت مشترک "جسم" باقی رہے گی، اب یہی عمل تحلیل اگر جسم اور دیگر انواع جوہر کے تشخصات کے ساتھ کیا جائے، تو "جوہر" باقی رہ جائے گا، جوہر اور اعراض کے ممیزات بھی اگر حذف کر دئے جائیں، تو اسم مشترک "ممکن" پڑے گا، اب ممکن و واجب کے ممیزات کی بھی تحلیل کر دی جائے، تو سب سے آخر میں "وجود مطلق" باقی رہے گا، اور یہی تمام ذوات وصفات کا منتہی ہے سے

تاچند حدیث جسم وابعاد وجہات — تاکے سخن معدن وحیوان ونبات
یک ذات فقط بود محقق نہ ذوات — ایں کثرت وہمی ز شئوں ست وصفات

(۱۹) لائحہ نوزدہم، یہ شئون وتجلیات جو ذات واحد میں مندرج ہیں، انکے اندراج کی وہ صورت نہیں ہوتی، جو کل میں جزو کے ظرف میں مظروف کے اندراج کی ہوتی ہے، بلکہ وہ صورت ہوتی ہے، جو موصوف وملزوم میں، اندراج اوصاف ولوازم کی ہوتی ہے۔ جیسے ایک کے عدد سے میں شمول، اندراج اس کے نصف اور ثلث اور ربع وغیرہ کسرات الیٰ غیر النھایۃ کا ہوتا ہے۔

(۲۰) لائحہ بستم، وجود مطلق کی حقیقت بجائے خود بدستور اور غیر متغیر رہتی ہو خواہ وہ اپنے ظہور کے لئے جو بھی قالب اور شئون واعتبارات کے اوپر جو بھی مظاہر اختیار کرے، ــــــ آفتاب کے نور سے پاک وناپاک دونوں منور ہوتے ہیں، آفتاب خود پاک یا ناپاک کچھ بھی نہیں ہوتا۔

(۲۱) لائحہ بست ویکم، عام فائدہ یہ ہے کہ

مطلق بے مقید نہ باشد و مقید بے مطلق صورت نہ بندد، امّا مقید محتاج است بہ مطلق، و مطلق مستغنی ست از مقید، پس استلزام از طرفین ست واحتیاج از یک طرف،

مطلق بغیر مقید کے نہیں پایا جاتا، اور مقید بغیر مطلق کے صورت نہیں اختیار کرتا، لیکن مقید محتاج ہوتا ہے مطلق کا، اور مطلق مستغنی ہے مقید سے، بس لزوم واستلزام تو دونوں جانب سے ہے، لیکن احتیاج صرف مقید کی جانب سے ہے،

(۲۲) لائحہ بست و دوم، اس کا لب لباب اس رباعی میں آگیا ہے،

ہمسایہ و ہمنشیں وہمرہ ہمہ اوست ۔ در دلق گدا و اطلس شہ ہمہ اوست
در انجمن فرق و نہانخانۂ جمع ۔ باللہ ہمہ اوست ثم باللہ ہمہ اوست

(۲۳) لائحہ بست و سوم حقیقت وجود اگرچہ تمام مظاہر میں مشترک ہے، پھر بھی مراتب وشئون میں بڑا تفاوت ہے، بعضہا فوق بعض، اور ہر مرتبہ کے لئے الگ الگ اسماء وصفات واعتبارات مخصوص ہیں، مرتبۂ الوہیت وربوبیت کے اعتبارات اور ہیں، اور مرتبہ عبودیت وخلقیت کے اور سب کو متحد کر دینا عین کفر و زندقہ ہے،

اے بردہ گمان کہ صاحب تحقیقی ۔ واندر صفت صدق ویقین صدیقی
ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد ۔ گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

(۲۴) لائحہ بست و چہارم، وجود حقیقی کے مراتب حد شمار سے خارج ہیں، اگر اس پر جب اطلاق اور لاتعیین کے پہلو سے نظر کی جائے، تو اس کا ادراک نہ کوئی عقل کر سکتی ہے، نہ کسی کشف کی رسائی اس تک ہو سکتی ہے، علم وعقل،

کشف و شہود سب اس مرتبۂ آخری کے ادراک و عرفان سے عاجز ہیں، ؎

ہر چند کہ جانِ عارف آگاہ بود کے در حرم قدس تو اش راہ بود
دست ہمہ اہل کشف و ارباب شہود از دامن ادراک تو کوتاہ بود

(۲۵) لائحہ بست و پنجم، حقیقت الحقائق اپنی ذات میں واحد ہے، شمار و عدد کا وہاں گذر نہیں، لیکن بہ لحاظ تجلیات و شئون کثیر و متعدد ہے، عین وحدت کے لحاظ سے اُسے حق سے موسوم کرتے ہیں، اور بہ لحاظ ظہور و تعدد یہی خلق ہے، ظہور و بطون، ازلیت و آخریت، سب اسی کے نسب و اعتبارات ہیں، اور یہی معنی ہیں آیہ کریمہ ھوالاول والآخر والظاھر والباطن کے۔

(۲۶) لائحہ بست و ششم، اس میں شیخ ابن عربیؒ کے اس قول کی شرح ہے کہ عالم عبارت ہے ان اعراض سے جو عین واحد میں کہ حقیقت ہستی ہے مجتمع ہوگئے ہیں، اور ان میں ہر لحظہ اور ہر آن تجدد و تبدل ہوا کرتا ہے، جیسا کہ آیہ کریمہ سے مترشح ہوتا ہے، بل ھم لبس من خلق جدید،

(۲۷) لائحہ بست و ہفتم، جمال وحدت حقیقی کے حق میں عظیم ترین حجاب اور کثیف ترین نقاب اس کے یہی تقیدات و تعینات ہیں، نظریں انھیں میں الجھ کر رہ جاتی ہیں ـــــ موجوں کے کھیل تماشہ میں دل ایسا نہیں جاتا ہے، کہ سمندر کی موجودگی کا احساس ہی جاتا رہتا ہے ؎

بحر یست وجود جاوداں موج زناں زاں بحر ندیدہ غیر موج اہل جہاں
از باطن بحر موج بین گشتہ عیاں بر ظاہر بحر، بحر در موج نہاں

(۲۸) لائحہ بست و ہشتم، حقیقت ہستی اپنے جمیع شئون و صفات، نسب و اعتبارات کے ساتھ ہر موجودگی حقیقت میں شامل و ساری ہے، شیخ محمود شبستری صاحب گلشن راز اسی مسئلہ کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

دل یک قطرہ را اگر بر تشنگانی بر موج آید از وصد بحر صافی

(۲۹) لائحہ بست و نہم، مظاہر سے جو فعل صادر ہوتے رہتے ہیں، ان کے صدور کا انتساب از روئے صورت ان مظاہر کی جانب، صحیح ہے، لیکن نہ از روئے حقیقت کہ نفس الامر میں سب کا انتساب صرف اسی ذات واحد کی جانب صحیح ہو سکتا ہے کہ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے، واللہ خلقکم وما تعملون

(۳۰) لائحہ سی ام، ہر امر وجودی بجائے خود خیر محض ہے، جس عمل میں شر وذم کا پہلو نکلتا ہے، وہ کسی فعل وجودی کا بجائے خود نتیجہ نہیں، بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ ایک فلاں امر وجودی نے دوسرے امر وجودی کو معدوم کر دیا —— زید اگر بکر کو قتل کر ڈالتا ہے تو یہ واقعہ اپنے اثباتی یا ایجابی پہلو یعنی زید کی قابلیت قتل کے لحاظ سے مذموم نہیں، بلکہ اپنے عدمی وسلبی پہلو سے مذموم ہے، یعنی اس اعتبار سے کہ اس نے بکر کی حیات کو مرتبۂ تکمیل تک نہ پہونچنے دیا،

(۳۱) لائحہ سی ویکم، اس میں شیخ صدر الدین قونوی کے ایک قول کی شرح کی ہے، اور یہ بتایا ہے کہ علم تابع ہے وجود کے، ہر حقیقت وجودی کے لئے ایک علم ہے، اور جو تفاوت حقائق وجود میں ہے، اسی کے متناسب تفاوت علم بھی رہتا ہے،

(۳۲) لائحہ سی ودوم جس طرح ہستی مطلق کی حقیقت، کائنات کی ہر ذات میں شامل ومندرج ہے، اسی طرح اس کے صفات بھی جملہ صفات موجودات میں جاری وساری ہیں۔

(۳۳) لائحہ سی سوم، اصل عبارت:۔

"حقیقت ہستی ذات حق سبحانہٗ وتعالیٰ اشئون ونسب واعتبارات
آں صفات او واظہار او مر خودش را متلبۃ بہذہ النسب والاعتبارات

فعل تاثیر او تعینات ظاہرہ مرتبۂ علیٰ ہذا الاظہار آثار او"
دسویں لائحہ سی و چہارم، حضرت حق کی تجلیات دو ہیں، ایک غیبی، اسکو صوفیہ فیض اقدس سے موسوم کرتے ہیں، دوسرے شہودی وجودی، اسکا اصطلاحی نام فیض مقدس ہے،

و امن تجلی ثانی مترتب بر تجلی اول ست ومظہرست بر کمالاتے مراکہ بہ تجلی اول در قابلیات و استعدادات اعیان اندراج یافتہ بود،	یہ دوسری تجلی اسی پہلی تجلی پر مترتب ہوتی ہے، اور جن کمالات کو تجلی اول نے درجہ قابلیت و استعداد میں مندرج رکھا تھا، ان کی یہ مظہر ہوتی ہے،

تاریخ تصوف کے بہت متاخر زمانہ کی بساط بھی نظروں کے سامنے پھر گئی۔ تصوف کی جگہ اب فلسفہ تصوف لے چکا ہے، اصطلاحیں تمام باہر والوں کی پھیل گئی ہیں، یہ سب ہے، لیکن گفتگو وہی توحید ہی پر جاری ہے، مشرکانہ خیالات، نیم مشرکانہ بدعات ورسوم کا نام بھی شروع سے آخر تک نہیں آنے پاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا فن توحید ہی سے شروع ہوتا ہے، اور توحید ہی پر ختم ہوجاتا ہے،

(۹) فقرِ محمدی

پرانے مشائخ طریقت میں ایک بزرگ شیخ احمد بن ابراہیم الواسطی گذرے ہیں، جن کو شیخ عبد الحق دہلویؒ "عالم عامل" اور "عارف کامل" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ

از کبار مشائخ دیار عرب بودو	عرب کے مشہور مشائخ میں سے
مقتدائے روزگار و در طریق اتباع	تھے اور اپنے زمانہ کے پیشوا اور
سنت و تقویم و ترویج ایں طریقہ	پیروی سنت رسولؐ اور اس کے
بے نظیر وقت خود بود،	پھیلانے میں اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے،

ان بزرگ کا عربی میں ایک رسالہ الفقر المحمدی کے نام سے ہے، شیخ دہلویؒ کو ایک نسخہ اس کا ہاتھ لگ گیا، اس کا فارسی ترجمہ انھوں نے تحصیل الکمال الابدی باختیار الفقر المحمدی کے نام سے کر دیا، جو ان کے مجموعۂ رسائل و مکتوبات میں نمبر پانچ پر شائع ہوا ہے، آج تصوف کے بہت سے دشمن اور مخالفین اور بہت سے دوست و موافقین، اس کو شریعت اسلام سے علیحدہ کوئی مستقل نظام سمجھ رہے ہیں، ان دونوں گروہوں کے حق میں، شاید اس کے بعض مطالب کا مطالعہ مفید ہو، ترجمہ لفظی نہیں حاصل ہے عنوانات میرے اضافہ کئے ہوئے ہیں، اور مضامین کی ترتیب بھی میری ہی قائم کی ہوئی ہے،

تصوف کا اصل اصول اگر تیرے درویشی اور اصلی فقیری کی طلب ہے، جس کی جگہ مقصود ہے جس کی تمائیں بلند ہوں تو لازم ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی فقیری اور درویشی کو اختیار کرو، اور انہی کی پیروی کرو کہ صاف اور پاکیزہ پانی وہیں ملتا ہے، جہاں سے چشمہ پھوٹتا ہے، اور بعد کے آنے والوں کی درویشی نہ اختیار کرو، کہ پانی سرچشمہ سے دور جا کر گندلا ہو جاتا ہے، اور اس کا رنگ اصلی قائم نہیں رہتا ہے،

اس مسلک کا انجام

اس طریقۂ محمدی پر اگر قائم رہے تو امید ہے کہ اگلوں سے جا ملو گے، جو پیغمبر خدا کے اصحاب میں تھے، قیامت کے روز پیمبر کے جھنڈے کے نیچے پیمبر اور یاران پیمبر کے ساتھ تمہارا حشر ہوگا، یہ وہ وقت ہوگا کہ دوسرے اپنے اپنے شیوخ اور مرشدوں کے جھنڈوں کے نیچے ہونگے لیکن تمہارے اوپر اس وقت تمہارے شیخ یعنی حضور رسول صلی اللہ وسلم کے جھنڈے کا سایہ ہوگا،

تصوف کے معنی

لوگوں کی زبان پر آج فقر، فقر ہے، لیکن اس کی حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں، نہ یہ جانتے ہیں کہ اس کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے، اور نہ یہ خبر ہے کہ اس کی انتہا کیا ہے، اگر فقر کے معنی سمجھ میں آجائیں اور اس کے ابتدائی مدارج کا علم ہو جائے تو اس پر اس کی انتہا کا بھی قیاس کیا جا سکتا ہے، فقر کے میدان میں قدم رکھنا صرف اسی وقت ممکن ہے کہ جب ممنوعات سے بچنے اور احکام کی تعمیل پر قدرت حاصل ہوئے۔

لازمی شرطیں

اس رنگ میں ڈوبنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے، جس طرح اپنے جسم کو گناہ سے محفوظ رکھتا ہے، اسی طرح فقیر اپنے دل کو خیالی گناہ سے محفوظ رکھے، اور اگر دل میں کبھی کوئی خطرہ پیدا ہو، تو فوراً اس سے توبہ کرے، فقیر ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کے دلوں میں مرضی الہی کے خلاف کسی خطرہ کا گذر ہی نہیں ہوتا۔ انھیں اس امر کی شرم ہوتی ہے، کہ خدا کی دوستی کا دعویٰ کر کے کسی

غیر خدائی خیال کو دل میں آنے دیں، یہ فقر کا ابتدائی مرتبہ ہے، جب تک یہ قدرت نہ حاصل ہو جائے، زبان پر فقیری کا نام لاتے ہوئے بھی شرمانا چاہیئے۔

گناہ سے بچنے، احکام کی پابندی کرنے، اور دل کو خطرات و وساوس سے محفوظ کر لینے کے بعد فقر کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ خدا کی طلب، اور محبت دل پر اتنی غالب ہو جائے کہ دنیا کے تمام فوائد و منافع بالکل جل جائیں اور ان کا خیال تک نہ آنے پائے، دل کو محض محبوب حقیقی و مطلوب اصلی کے لئے مخصوص ہو جانا چاہیئے، اور ماسوی سے بالکل خالی ہو جانا چاہیئے جب تک یہ کیفیت نہ طاری ہو جائے، فقیری کا دعویٰ کرنے سے شرمانا چاہیئے۔

کاملین کا مرتبہ اوپر جو شرطیں بیان کی گئیں، یہ مبتدیوں کے لئے ہیں، جب دل کو انھیں کے سننے کی تاب نہیں، اور ان پر عمل کی توفیق نہیں تو پھر کاملین کے مرتبۂ کمال کو وہ کیونکر سمجھ سکتا ہے، اور اس کی تشریح اس مختصر رسالہ میں کیسے کی جا سکتی ہے، صرف ان کے مرتبہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے،

جھوٹے مدعی رونے کا مقام ہے کہ ہم میں ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے، جو حرام کھاتا ہے اور باطل میں مشغول رہتا ہے، جو ان لوگوں کو مل جائے وہی ان کے نزدیک حلال ہے، اور جو نہ ملے وہ حرام ہے، دن رات انھیں یہ دھن سوار رہتی ہے کہ لذیذ غذائیں کھانے کو اور خوبصورت چہرے دیکھنے کو اور نغمہ کی آوازیں سننے کو ملتی رہیں۔ اور اس دھن میں یہ بڑے بڑے دعوے نکالتے ہیں اور اپنے میں وجد و حال ظاہر کرتے ہیں، تاکہ عوام ان کے معتقد ہوں اور انھیں دنیا کچھ اور ہاتھ آئے، ان کو نہ حلاوت اسلام سے واسطہ اور نہ لذت ایمان سے سروکار، ساری ساری رات رقص و سماع میں مصروف رہتے ہیں اور نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، تو گویا ٹکریں مار کر ڈھڈ کھڑے ہوتے ہیں، اور امیروں اور بادشاہوں کے یہاں آمد و رفت،

اور ان سے نذریں حاصل کرنے پر فخر کرتے ہیں خدا تعالیٰ ان کے شر سے بچائے کہ دنیا کے رہزنوں سے کہیں بڑھ کر دین کے رہزن ہیں، دنیا کا رہزن مال لیجاتا ہے، اور یہ دولتِ ایمان پر ہاتھ صاف کرتے ہیں لوگوں پر انکے لباس فقر کا اثر پڑتا ہے اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ فقیری اسی کا نام ہے،

سچے فقیر کی علامات محمدی فقیروں کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کے ذوق سے مست رہتے ہیں، اس کی آواز پر وجد کرنے لگتے ہیں، اور اس کے سننے کے وقت ان پر خود متکلم (یعنی خدا) کی تجلیوں کا ظہور ہونے لگتا ہے، کیسے غضب کی بات ہے کہ جس محبوب کی محبت کا دعویٰ کیا جائے، اسی کے کلام میں لطف نہ آئے اور اس کے لئے طبیعت حاضر نہ ہو، اور لطف آئے تو شعر و قصیدہ پر، گانے بجانے اور تالیوں پر!

سماع اور قرآن اللہ کے دوستوں اور عاشقوں کے لئے ساری لذت و حلاوت قرآن میں ہے، اور ان کی راحت و تسکین کا سامان اسی میں ہے، کلام کے ساتھ ان کا دل متکلم سے وابستہ ہو جاتا ہے، اور قرآن و حدیث، مواعظ و اخبار، وعد و وعید کو سنتے ہی ان کے دلوں میں گداز پیدا ہو جاتا ہے، اور متکلم کی ہستی میں وہ اپنی عظمت گم کر دیتے ہیں، اور جو یہ کہا جاتا ہے کہ شعر کو نہ کہ قرآن کو طبیعت بشری سے خاص مناسبت ہے، اس لئے اشعار کو سُن کر دل میں تندرۃً تحریک پیدا ہوتی ہے، سو یہ قول لغو و بے حقیقت ہے، اس لئے کہ شعر کے وزن اور موسیقی کے تال سُر پر حرکت کرنا جبلت حیوانی کا تقاضا ہے، چنانچہ حیوانات اور بچے سب اچھی موسیقی سے اثر قبول کرتے ہیں، یہ فطرت حیوانی ہے، انسان کی اعلیٰ فطرت کا درجہ اس سے کہیں بلند ہے، جن کے دلوں میں ایمان گھر کر چکا ہے، اور محبت الٰہی حلاوت حاصل کر چکی ہے، جیسا کہ حضرات صحابہؓ اور ان کے بعد

آنے والے کا حال تھا، سو ان کے قلوب کو حرکت میں لانے والی اور ان کے شوق وجد، رقت، اور خشوع کو بڑھانے والی شے قرآن پاک کی سماعت ہی ہوسکتی ہے،

عملی ہدایات صحیح تصوف یا فقر محمدی میں قدم رکھنے والوں کے لئے عملی ہدایتوں میں سے پہلی شے یہ ہے،

اپنے پروردگار کے سامنے جس نے قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نعمتیں اتاری ہیں، صدق دل سے توبہ کرنا، پھر تنہائی میں جاکر، سب کی نظروں سے الگ، وضو کرکے دو رکعتیں پڑھنا، اس سے فارغ ہو کر ننگے سر، ہاتھ باندھے ہوئے اپنی خطاؤں پر نادم ہو کر اتنی دیر کھڑے رہنا کہ دل میں گداز پیدا ہو جائے، اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو جائیں، اسوقت رورو کے توبہ و استغفار کرنا، الفاظ حدیث کے مطابق سید الاستغفار پڑھنا پھر بطریق پیروی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قائم و مضبوط رہنے کے لئے توفیق چاہنا اور آیندہ کے لئے مضبوط عہد کرنا، کہ آنکھ، کان، زبان، شکم، شرمگاہ، اور ہاتھ پیر ہر قسم کے گناہ سے محفوظ رہیں گے، ایسا کہ جب دن ختم ہو تو نہ زبان کسی کی بدگوئی، جھوٹ، بدزبانی وغیرہ سے آلودہ ہوئی ہو، نہ کان نے کوئی بیجابات سنی ہو، اور نہ آنکھ کسی ایسی چیز پر پڑی ہو، جس کا دیکھنا شرعاً پسندیدہ نہ تھا، اور نہ خالق و مخلوق میں سے کسی کا حق اپنے اوپر باقی رہنے دے،

عملی ہدایات کی دوسری دفعہ یہ ہے کہ نماز باجماعت، اپنے ارکان و آداب حضور قلب وغیرہ کی پوری پابندیوں کے ساتھ ادا کی جائے، ایسی کہ حدیث میں جو لفظ "احسان" آیا ہے، اس کی پوری عملی تفسیر ہوتی رہے، حال صحیح وہی ہے، جو حالت نماز میں طاری ہو، بندہ اور پروردگار کے درمیان رابطہ پیدا کرنے والی شے نماز ہے، پس اگر نماز میں حضور قلب نہیں پیدا ہوتا تو اس کا کوئی حال معتبر

نہیں، اس لئے کہ جس بندہ کے حجابات ایسی منزل قرب میں بھی پہونچ کر دور نہیں ہوئے، اس کے لئے کسی دوسرے موقع پر اس کی کیا امید ہو سکتی ہے، حیف ہے کہ سماع شعر کے وقت تو قلب حاضر ہو لیکن جو وقت عین حضوری حق کا ہوتا ہے، اسی وقت غائب ہو، ایسی فقیری فاسد اور ایسی درویشی ناجائز۔

بنیاد کار سچے تصوف کی بنیاد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و ربط قلب پیدا کرنے پر ہے، اپنے دل کو اس ذات گرامی کی محبت میں اٹکایا جائے، اسی کو اپنا شیخ اور اپنا امام بنایا جائے، اسی کے نام پر بکثرت درود و صلوٰۃ بھیجا جائے اور اسی کے ساتھ پیوند محبت مستحکم کر لیا جائے، تمام درویشوں کو دیکھا ہوگا کہ ان کے دلوں میں، ان کے مرشدوں کی عظمت ایسی بیٹھ جاتی ہے کہ وہ جب کبھی اپنے شیخ یا مرشد کا نام سنتے ہیں تو بے چین ہو جاتے ہیں، یہی کیفیت، یہی نسبت قلب سچے درویش کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ پیدا کر لینا چاہیئے، اپنا امام اور اپنا شیخ انہی کو بنانا چاہیئے، دل میں خیال آئے تو انھیں کا، آنکھوں میں صورت پھرتی رہے تو انہی کی، کان اذنت حاصل کریں تو انہی کے نام مبارک سے، عظمت کا احساس ہو تو انہی کے ذکر سے، زبان انہی پر درود بھیجنے میں لگی رہے، دل میں ان ہی کے حالات سننے اور جاننے کا ذوق پیدا ہو، حدیث و آثار کے پڑھنے سے علاقہ محبت کو اور ترقی ہو، شوق و اشتیاق ہو تو انہی کا، یاد ہو تو انہی کی پیروی ہو تو انہی کی، ہر امر میں انہی کے حکم کی تعمیل اور پیروی کا شوق غالب ہو، اور ان کی پیروی میں اتنی شدت برتی جائے کہ ہر شخص دیکھتے ہی "محمدی" سمجھ لے،

رسالہ کے اہم ضروری مطالب کا ملخص سطور بالا میں آگیا، شیخ عبدالحق دہلوی ان تمام مطالب کو نقل کر دینے کے بعد خود بھی ان کی پرزور تائید کرتے ہیں،

—— اب اہل طریقت و اہل شریعت دونوں فرمائیں کہ کسی گروہ کو اس پر حرف رکھنے کی کوئی گنجائش ہے؟

ہمارے سچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دنیا کو یہ پیام پہنچا تھا کہ غیر مسلم اگر خدائے واحد و یکتا کی پرستش پر متفق ہو جائیں تو مسلمانوں سے فوراً صلح ہو سکتی ہے، اگر آج سارے اسلامی فرقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم برحق کی محبت و اطاعت کے مرکزی نقطے پر جمع ہو جائیں تو آپس کی رنجش و نقیض رد و کد کے لئے گنجائش ہی کیا رہ جاتی ہے؟
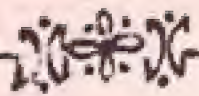
ضمیمہ
مرشد کی تلاش

(منقول از سچ، بعد نظر ثانی کامل)

خیر آباد (ضلع سیتا پور اودھ) سے ایک صاحب کا بہت طویل مراسلہ مہینوں سے آیا ہوا پڑا ہے، دوسرے مضامین کے ہجوم نے اب تک توجہ نہ کرنے دی (اور یہ سچ اور صدق کی تاریخ میں کوئی بات نہیں) مراسلہ کا زیادہ ضروری حصہ حسب ذیل ہے:

"مدت سے میں ایک ضمیری الجھن میں مبتلا ہوں، کوئی روحانی طبیب مجھے ملتا نہیں، بحیثیت مسلمان پیری مریدی سے متعلق آپ کے حقیقت آگیں خیالات سے مستفیض ہونا چاہتا ہوں، خوش نصیبی یا بدنصیبی سے میرے خاندان میں دونوں شغل ہوتے ہیں، مجھے اب تک کسی اللہ والے سے نسبت ارادت حاصل نہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے پیری مریدی کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ ملت مرحومہ کے لئے من حیث الاسلام یہ کہاں تک لازمی ہے؟ کیا قرن اول میں جو اسلام کا عہد سعادت تھا اس کی مثالیں ملتی ہیں؟ عہد نبوت و عہد صحابہ کے بعد دورِ تابعین میں بھی کیا پیری مریدی کی یہ کثرت اور

غیر خوش آیند بتاتی تھی؟ تمسک بالکتاب والسنۃ کے بعد کیا یہ بھی لازمی ہے کہ کسی رسمی پیر کی پیروی کی جائے؟ ایک مسلمان طاعات الٰہیہ کا پابند، اللہ سے ڈرتا ہے، سچ بولتا ہے، مشائخ کرام وصلحائے امت کا ادب و احترام رکھتا ہے، لیکن عرف عام میں مرید نہیں؟ کیا عند اللہ وہ اس کا بھی ذمہ دار ہے؟ اگر بیعت کا مقصد دعوت الی الحق، رشد وہدایت وغیرہ ہے، تو آج کل پیروں کی جماعت عموماً یہ خدمت کہاں تک انجام دے رہی ہے؟ پھر محترم علمائے امت کی موجودگی میں اس سے الگ اس جماعت کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پھر اگر اس وقت اس جماعت میں کچھ صاحبان علم وعمل افراد ہیں بھی تو ان میں ایسوں کا تو بالکل پتہ نہیں، جو بلا خوف لوم لائم اظہار حق میں بیباک ہوں،

صحابۂ کرام کی زندگیوں کے مرقع محفوظ ہیں، کیا اُن سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں دو جماعتیں ہونی چاہئیے، ایک دین کی رہنمائی کے لئے اور دوسری دنیا کی، یا یوں کہا جائے، ایک مسلمانوں کے قلب وضمیر کی اصلاح کرے اور دوسری شریعت کے ظاہری احکام کی طرف رہنمائی کرے؟ اس کے علاوہ کوئی مسلمان اگر اپنی فطری صلاحیت سے اپنے اخلاق کی اصلاح کرنا چاہے، تو کیا یہ ممکن نہیں؟

یہ بھی ارشاد ہو جائے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ الجاہلیۃ کا کیا مفہوم ہے؟ اور امام سے مراد امیر امت، قائد عسکر، مرشد طریقت و امام جماعت سب ہو سکتے ہیں، لیکن اول الذکر دونوں صورتوں میں ہندوستان کے کروروں حلقہ بگوشان اسلام کے لئے صورت تشفی کیا ہے؟

مشائخ کرام قرآن مجید کی سورۃ الفتح کی آیت ان الذین یبا
یعونک انما یبایعون اللہ الخ سے بھی استدلال فرماتے ہیں، اور
بیعت طریقت کو لازمی گردانتے ہیں، کیا موجودہ مروجہ بیعتوں کو کوئی نسبت
اس سے ہے، اور یہ بیعتیں کس حکم میں داخل ہیں؟ ایک بیعت اس خیال
سے بھی کی جاتی ہے کہ تمام عمر جو کچھ بھی کرتے رہو، لیکن اگر کسی سلسلۂ عالیہ
میں داخل ہو گئے تو بس تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے،
اب واقعی بیعت کی دو صورتیں رہ گئی ہیں، ایک کسی مسلمان کا اپنے
گناہوں پر پشیمان ہونا اور کسی محترم شخصیت کے ہاتھ پر ترک گناہ کا عہد
کرنا، مگر ظاہر ہے کہ آج کل یہ خیال سرے سے پیش نظر ہی نہیں، اب رہی
دوسری صورت اور وہی یقیناً مبارک ہے، یعنی کسی مسلمان کو پورا پورا
پابند شریعت اور متبع سنت پائے اور اس کے قدم بہ قدم چل کر اپنی
دنیا و عاقبت سنوارے، لیکن جناب محترم مجھ سے کہیں زیادہ باخبر ہیں کہ
آج مسلمان اس پر کہاں تک عامل ہیں ... . جامعہ عثمانیہ کے
ایک ممتاز فاضل سے گفتگو آئی، اُن کی تقریر کا ماحصل یہ نکلا کہ مسلمان
ان معاملات میں بھی دوسرے اقوام کے عقائد و خیالات سے متاثر ہوئے
ہیں، اور انھوں نے تاریخی شہادتوں سے استناد کیا۔"

مراسلہ نویس کے دل میں جو خیالات اور سوالات پیدا ہوئے، بہتوں کے
ذہن انہی الجھنوں میں پڑے ہوئے ہیں، اور سچ یہ ہے کہ جس سے وہ اپنی تشفی چاہتے
ہیں وہ خود بھی کسی طبیب روحانی کا محتاج ہے، تاہم بعض پرانے مریض طبیبوں
کی باتیں سنتے سنتے، ان کی دربار داری کرتے کرتے خود بھی نیم طبیب سے ہو جاتے
ہیں، اور اگر خود بدستور بیمار ہی چلے آتے ہوں تاہم اپنے تجربوں سے نئے مریضوں کو

کچھ تو ڈھارس بندھا ہی سکتے ہیں،

سب سے پہلے ایک اہم اور بنیادی حقیقت کو پیش نظر کر لیجیے، صاف و صریح اتنی کہ اس کی وضاحت و صراحت بھی اکثر اس کی اہمیت کو نظروں سے گرائے اور دلوں سے بھلائے رکھتی ہے، اور وہ حقیقت یہ ہے کہ آج جو علوم ظاہری خالصۃً دینی کہے اور سمجھے جاتے ہیں، اور سب ہی اپنی موجودہ متعین و منضبط ہیئتوں اور صورتوں کے ساتھ مصطلحات کا انبار عظیم لئے ہوئے، بدعت کے لغوی مفہوم کے اعتبار سے بدعت ہی میں داخل ہیں۔

تفسیر، اصول تفسیر، فقہ، اصول فقہ و کلام کے آج جو ماشاء اللہ دفتر کے دفتر موجود ہیں، عہد رسالت میں یہ کہاں تھے، اور سب کو جانے دیجئے، براہ راست سنت رسول ہی کو لیجئے، آج حدیث کے متن ہی کا کتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے، پھر ان کی شرحیں ہیں، ان کی تسہیل کے لئے مستقل لغت ہیں، دفتر روایات و آثار کی کتنی مختلف قسمیں اور طبقات ہیں، سب کے الگ الگ مرتبے اور درجے ہیں رجال کا ایک مستقل فن ہے، احادیث کے جانچنے اور پرکھنے کے لئے روایت اور درایت کے قانون و ضابطے ہیں، مصطلحات فن کی تعداد سینکڑوں کی ہے، فن حدیث میں مہارت پیدا کرنے کے لئے برسوں کی محنت و مطالعہ اور مدتوں تک استادوں اور کاملین فن کی ہدایت اور صحبت لازمی ہے، ظاہر ہے کہ عہد رسالت میں یہ کچھ بھی نہ تھا، رسول عالم کی سادہ اور معمولی روزمرہ کی گفتگو حدیث تھی اور آپ کا ہر اچھوتا ہر عمل سنت۔۔۔ تو کیا اب کوئی اس بنا پر حضرات محدثین کی ساری کوششوں اور کاوشوں کو "بدعت" کہہ دینے کی جرأت کرے گا؟

اسی طرح حضرات فقہا کی ساری موشگافیاں، قیاس و اجماع کی بحثیں، استقراد و استنباط، تقلید و اجتہاد کے مسائل، عبارۃ النص اور اشارۃ النص، دلالت النص

اور انقضاء النفس کی قسم کی سیکڑوں اصطلاحیں دورِ نبوی میں کہاں تھیں، اور کہاں سے ہوسکتی تھیں تو کیا کوئی بخاریؒ، مسلمؒ، ترمذیؒ، و ابوداؤدؒ کی طرح ابو حنیفہؒ و شافعیؒ، مالکؒ و احمدؒ، نخعیؒ و اوزاعیؒ، شیبانیؒ و طحاویؒ کی بھی جانفشانیوں کو ضائع قرار دینے اور "بدعت" کے حکم میں لانے کی جرأت کر کے، شریعت ہی کے بہت بڑے حصے سے انکار کر گذرے گا؟ ——— اور تو اور خود قرآن مجید اسی مکتوبی شکل میں اعراب و علامات وقف سے مزین، پاروں، سورتوں، رکوعوں اور آیتوں کے ساتھ مدون، عہد رسالت میں کہیں یکجا موجود تھا؟

بات بالکل صاف اور موٹی ہے، لیکن ذہن انسانی کا یہ بھی کچھ خاصہ سا ہے، کہ سامنے کی چیزوں کو اکثر ناقابل التفات سمجھے رہتا ہے، اور دور دراز کی باریکیوں میں الجھنے کا شوق رکھتا ہے، تو غرض یہ کہ جو حال فقہ کا ہے، حدیث کا ہے، تفسیر کا ہے، جملہ علوم ظاہری شرعی کا ہے، کچھ ویسا ہی حال علم باطن یعنی سلوک و تصوف کا ہے، عہد نبوی میں بے شک نہ لفظ تصوف رائج تھا نہ صوفی، اور نہ ذکر و شغل، حال و مقام مکاشفہ و مراقبہ کی وہ سیکڑوں اصطلاحیں چلی ہوئی تھیں، جن سے آج کتب فن لبریز ہیں، خود مرشد اور شیخ اور بیعت اور مسترشد، بھی اس اصطلاحی معنی میں ناپید تھے، لیکن غرض یہ ہے کہ اس اصطلاحی معنی میں خود فن حدیث ہی کہاں موجود تھا، نہ کوئی اسماء الرجال کے نام سے آشنا تھا، نہ جرح و تعدیل کے اصول و قواعد سے نہ ضعیف اور موضوع اور متواتر اور مشہور اور صحیح و حسن کی اصطلاحیں مقرر ہوئی تھیں، نہ کسی دماغ میں مدلس اور طبقات المدلسین کا مفہوم تھا، لیکن اگر نام و اصطلاح کی بحث سے گذر کر نفس حقیقت اور اصل مغز تک پہونچنا مقصود ہے، تو جس طرح ہر صحابی، یا بزم رسولؐ کا صحبت یافتہ اور دربار رسولؐ کا حاضر باش، اپنی اپنی جگہ اور اپنے درجہ ظرف اور بساط و استعداد کے موافق مفسر تھا اسی طرح صوفی و سالک بھی تھا یعنی اپنے اپنے ظاہر

کے ساتھ اپنی باطن کی بھی اصطلاح کا طالب! — صحابہ کرام رضؓ سب کے مریدین و مرشدین تھے، اور سب کا شیخ اور مرشد کل، وہی جو ساری دنیا کے لئے معلم و مزکیؐ و مطہرؐ ہو کر آیا تھا۔

کہا ہے کہ تمسک بالکتاب والسنۃ کے بعد کسی رسمی شیخ کی ضرورت کیا باقی رہ جاتی ہے — دُہرا مغالطہ سوال کے اندر موجود ہے، ایک تو لفظ رسمی، خود تمسک بالکتاب والسنۃ بھی اگر محض رسمی ہی ہے، حقیقت سے خالی، تو کچھ زیادہ مفید نہیں، اصل ضرورت تو مردہ رسم میں حقیقت کی جان ڈالنے کی ہے اور پھر دوسری بات یہ کہ حقیقی تمسک بالکتاب والسنۃ بغیر کسی زندہ شخصیت کے توسط کے عموماً اور عادۃً ممکن (اور ممکن بھی ہو تو آسان) کب ہے؟

حدیث وسنت کے جن نوشتوں کو آج ہم سرچشمۂ تقدیس سمجھ رہے ہیں تو کیا تقدس انکے حروف و نقوش کا کاغذ کی سفیدی اور روشنائی کی سیاہی میں کچھ رکھا ہوا ہے انکے تقدس کی بنا بس اسی قدر تو ہے کہ انکے اندر دنیا کی زندہ ترین شخصیت کی روح کسی حد تک زندہ ہے یہ روح کیسی عجیب بات ہوگئی کہ بیجان کاغذ کے بیجان ورقوں میں تو منتقل ہو جائے اور انسان جسے اللہ نے روئے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے، اس کے زندہ قالب و قلب میں منتقل نہ ہوسکے، یہ روح الماریوں کے سفینوں میں تو محفوظ رہ جائے، اور راست بازوں اور پاک سرشتوں کے سینوں کو مشتعل و منور نہ کر دے تلک اذا قسمۃ ضیزی،

شریعت ظاہر کا طالب علم کہتا ہے، کہ ہم کو فلاں اقوال و فلاں اعمال کی تعلیم فلاں فلاں کتابوں کے ذریعہ سے رسول اکرمؐ سے حاصل ہوئی ہے۔ طریق باطن کا سالک سناتا ہے کہ ہم کو فلاں احوال اور فلاں مقامات کی تحصیل فلاں اور فلاں شخصیتوں کے واسطہ سے رسول اکرمؐ سے ہوئی ہے! اب فرمائیے کہ دونوں راہوں کے درمیان اصلی اور اساسی فرق کیا ہوا؟

قرآن مجید رسولؐ کا تو کلام نہیں، اللہ کا کلام ہے، اور بندوں ہی کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے۔ یہی ہم سب کا ایمان ہے، اور قرآن مجید اس دعوے کی بار بار صراحت کرتا ہے، کہ اس میں ساری ضروری ہدایتیں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں، بایں ہمہ یہ نہ ہوا کہ قرآن لکھا لکھایا براہ راست تمام بندوں کے پاس پہنچ جاتا۔ منکرین اور مومنین اسے آسمان سے اترتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے۔ کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر رکھا ہوا مل جاتا، یا ایک روز جب صبح ہوتی تو اس کا ایک ایک نسخہ ہر شخص کے سرہانے موجود ہوتا۔ قادر مطلق کے لئے ان میں سے کوئی شے دشوار تھی؟ لیکن حکیم برحق نے یہ کچھ نہ کیا، بلکہ اس کے برعکس یہ طریقہ اختیار کیا کہ پہلے ایک تباہ کار قوم کے درمیان، جو جغرافی اعتبار سے اُس وقت کی آباد و مہذب دنیا کے عین مرکز میں آباد تھی، ایک پاکیزہ سرشت سلیم الفطرت صالح مزاج انسان پیدا کیا، ۴۰ سال کی عمر تک اُس شخصیت کو اس قوم کے درمیان ہر قسم کے سابقہ اور تعلق کے ساتھ چلتا پھرتا ہوا رکھا اور اس کی سرشت و سیرت، عادات و اطوار کی جزئیات تک کی جانچ اور پرکھ کا موقع اس کی قوم والوں کو دیا۔ جب یہ سب مرحلے طے ہو چکے، جب جا کر پیام کا نزول شروع ہوا۔ پھر اُس وقت بھی 'پیام' سے پیشتر 'پیامبر' ہی کی شخصیت کو پیش کیا گیا، اور جب قوم اس شخصیت کے صادق اور امین ہونے کا اقرار کر چکی اُس کے بعد اُس سچے کی زبان سے سچے کلام کی ادائی شروع ہوئی۔ اس پر بھی سارے پیام کو دفعتہً پیش نہیں کر دیا گیا، بلکہ پیامبر کی شخصیت پر مختلف دور اور طور طاری کر کے ۲۲-۲۳ سال کی مدت میں بہت ہی تدریج کے ساتھ اس پیام کو انجام تک پہونچایا گیا۔ پس فطری و ربانی ترتیب تو یہ ٹھہری کہ پہلے پیامبر پھر پیام۔ پہلے طبیب پھر نسخہ، پہلے ہادی پھر ہدایت، اب اگر ہم اس ترتیب کو الٹ دینا چاہیں، اور ہادی سے قطع نظر کر کے ہدایت تک، اور اشخاص سے بے نیاز ہو کر

مسائل تک پہونچ جانا چاہیں، تو یہ فطری اور ربانی ترتیب سے موافقت نہ ہوئی۔

اور یہ خیال نہ گزرے کہ یہ طریق دعوت و اسلوب ہدایت کچھ وحی الٰہی اور ذات پیمبر کے ساتھ مخصوص رہا ہے، نہیں بلکہ خود رسول نے اپنے قصد و ارادہ سے تبلیغ دین کا جو طریقہ اختیار کیا وہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا، آپ نے یہ نہ کیا کہ قرآن مجید کے کامل نسخوں سے اس کے اجزاء کی نقلیں کرا کے اپنے ملک کے اطراف و جوانب میں بھیج دیتے، یا اپنے اقوال و سنن کو ضبط تحریر میں لا کر ملک میں ان نسخوں کی اشاعت کر دیتے، بلکہ آپ نے ایک بہت بڑی جماعت اپنے صحابیوں، رفیقوں، شاگردوں مریدوں ہی کی پیدا کی، اشخاص ہی تیار کیے، جو اپنی زندگیوں کے لحاظ سے آپ کی تعلیم اور آپ کے عمل دونوں کے جیتے جاگتے نمونے، چلتے پھرتے نسخے، بولتے چالتے مرقعے تھے، اور دین کی روشنی آپ نے انھیں زندہ مشعلوں کے ذریعے سے پھیلائی۔ آپ نے یہ نہ کیا کہ کسی گوشہ میں خلوت نشیں ہو کر سکوت و عافیت کے فضا میں، قلم اور دوات لے کر بیٹھ جاتے، اطمینان سے تصنیف میں مشغول ہو جاتے، اور توحید و رسالت و معاد کے عقائد پر مقالے اور معاملات و عبادات پر رسالے تیار فرمانے لگتے بلکہ آپ نے نور ہدایت سے براہ راست قلوب و نفوس کو منور کرنا شروع کر دیا۔ آپ کی یادگار، آپ کی کوئی کاغذی تصانیف نہیں، بلکہ وہ انسانی تصانیف ہیں، گوشت و پوست کے بنے ہوئے جسم اور تقویٰ و طہارت میں ڈھلی ہوئی روحیں ہیں، ان زندہ تصانیف کی تعداد ہزارہا تک پہونچی اور ان میں سے مشہور ترین کے نام ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ ہیں۔

پھر یہ حضرات بھی اپنے اپنے عہد اور دور میں کتابی تصنیف و تالیف پر ذرا بھی متوجہ نہ ہوئے، حالانکہ اس وقت عجم و روم کے علوم و فنون و صنائع مسلمانوں کے علم میں آچکے تھے، بلکہ یہ بھی برابر اسی میں لگے رہے، کہ زندہ ہستیوں کو اپنے نمونہ پر

ڈھالتے رہیں، اور اپنے شاگردوں کے جسموں میں اپنی روحوں کا نفخ دم کرتے رہیں، اور اپنے چراغ سے دوسرے چراغ بھی روشن کرتے رہیں، —— یہ جو اتنے فضائل و کمالات آپ صحابہؓ کے، اہلِ بیتؓ کے، مہاجرینؓ کے، انصارؓ کے، تابعین کے، تبع تابعین کے، سنتے چلے آئے ہیں، تو خود ان الفاظ ہی پر غور کیجئے، کہ یہ کون لوگ ہیں؟ وہی صحبت اور رفاقت کے رکھنے والے، بیعت کرنے والے ارادت رکھنے والے، شاگرد و مریدین ہی ہیں یا کوئی اور؟

مادی علوم و فنون میں آج کون سا علم و فن یا دستکاریوں میں سے آج کون سی صنعت ایسی ہے، جس میں استاد کی مدد ناگزیر نہیں، شاعری، ادب، طب، قانون، ریاضی، انجینیری، آخر کون سا شعبۂ زندگی؟ درآنحالیکہ ہر علم و فن اور ہر صنعت پر بیشمار کتابیں چھوٹی اور بڑی، مبتدی و منتہی دونوں کے کام کی موجود ہیں۔ تو پھر آپ کی عقل یہ کیسے قبول کر لیتی ہے، کہ روحانیت کا علم جو ان سب علوم سے لطیف تر ہے، وہ بے استاد رہ جانے سے کوئی نقص پیدا نہ کرے گا؟ اور تزکیۂ نفس کا فن جو سارے فنون سے دقیق تر ہے، محض کتابوں کی مدد سے پورا آجائیگا؟ اللہ کی معرفت جو مخلوق کی ہر معرفت سے نازک تر ہے، بغیر کسی رہبر و معلّم کے از خود پوری طرح حاصل ہو جائے گی؟ —— استاد اور رہنما تو اس سفر میں قدم قدم پر ناگزیر ہے، اور اسی استاد یا رہنما کا اصطلاحی نام شیخ یا مرشد ہے،

کہا گیا ہے کہ علماءِ حق کے ہوتے ہوئے پیروں اور مشائخ کی ضرورت کیا ہے، لیکن عرض یہ ہے کہ یہ "علماءِ حق" اور "مرشدین" و "شیوخ" کی درمیانی تفریق تو ہماری آپ کی قائم کی ہوئی، حقیقتہً اور اصلاً ہے کب؟ قرآن تو صالحین، صادقین، متقین، مومنین، موقنین، خاشعین، محسنین، ذاکرین، مخبتین، قانتین، عابدین، صابرین، شاکرین، مخلصین کی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے، اور وہ ہستیاں علم و عمل

کی، حال و قال کی، قلب و قالب کی، ظاہر و باطن کی، فقہ و درویشی کی جامع ہوتی تھیں۔ اس میں ہماری خود ساختہ تفریق "علم" و مشیخت کی گنجائش ہی کہاں ہے؟ یہ تفریق تو دوسری بہت سی تفریقوں کی طرح دور انحطاط نے پیدا کر رکھی ہے، اور وہی اس تفریق کلی کا ذمہ دار ہے۔ تذکرۃ اولیا یا اس سے ملتی جلتی ناموں کی جتنی بھی پرانی کتابیں ملتی ہیں، انہیں اٹھا کر دیکھ لیجئے، سری سقطی اور جنید بغدادی، معروف کرخی، اور بایزید بسطامی، ذوالنون مصری، اور فضیل بن عیاض سے قبل نام ابو حنیفہ و شافعی مالک و احمد کے اور ان سے بھی قبل نام خلفائے راشدین کے نظر آئیں گے۔

طریق کی اہم حقیقت شیخ یا مرشد کی صحبت ہے، لفظ 'صحابی' ہی زہد و طاعت تقوی و عبادت و علم و فضل غرض کسی اور وصف کو نہیں، "صحبت" ہی کی اہمیت کو واضح کر رہا ہے، اور مرشد بھی وہی ہوتا ہے جس کا نفس خود ہی تزکیہ حاصل کیے نہیں ہوتا، بلکہ اپنی صحبت و رفاقت سے دوسروں پر بھی اثر تزکیہ ڈال سکتا ہے اور جو اپنے کمالات کو دوسروں تک متعدی کر سکتا ہے، شیخ وہ مصلح ہوتا ہے، جو یہ صلاحیت رکھتا ہے، کہ اپنی ہم نشینی سے دوسروں کی فطری صلاحیت کو ابھار سکے، پس مرید ہونے یا بیعت میں داخل ہونے کے معنی اس سے زائد اور کچھ نہیں، کہ جس کے صالح و صادق ہونے پر بھروسہ ہو، اور جس کی شان طاعت و تقوی سے اپنا ضمیر و وجدان مطمئن ہو، اس کے اتباع کا قصد و اہتمام کیا جائے، اور طاعت و نیازمندی کے ساتھ اس کی خدمت میں حاضری دی جائے، بیعت اور مریدی اس معنی میں بدعت ہونا کیا معنی ہیں، عین حکم الٰہی وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ کی تکمیل ہے، پوری آیت ملاحظہ ہو،

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا (۲) اتَّقُوا اللَّهَ (۳) وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ

گویا محض ایمان کافی نہیں، ایمان والوں ہی سے تو خطاب ہے، ایمان تو وہ لاہی چکے ہیں، اب ان سے کچھ اور مطالبہ بھی ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہو کہ "اے ایمان والو! اللہ سے تقوی اختیار کرو" ادائے حقوق، اجتناب معصیت وغیرہ سب اس حکم تقوی کے تحت میں آگئے، لیکن اتنا ہی کافی نہیں، مزید حکم ملتا ہے کہ "صادقون کی معیت اختیار کرو، راست بازوں کی صحبت ورفاقت میں رہو"

اور یہی عین مریدی ہے،

مشکل یہ ہے کہ ادھر نام تصوف کا لیا گیا، اور ادھر ذہن کے سامنے آج کل کے مشائخ اور شاہ صاحبوں اور سجادہ نشین پیرزادوں کی اور انکی محفلوں کی تصویریں سامنے آجاتی ہیں غالی عقیدت مند چاروں طرف سے حلقے میں لئے ہوئے ہیں، درمیان میں شاہ صاحب گیروے کپڑوں یا صندلی لباس میں تشریف فرما ہیں، کوئی کام ہے نہ کاج، نہ دینی تذکرے، نہ پند اور مواعظ، نہ نماز نہ قرآن، نہ ادائے حقوق عباد اور جائز کسب معاش کی کوئی فکر واہتمام، پان پر پان چبائے جارہے ہیں چائے کا دور چل رہا ہے، اور یا پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ قوالی کی محفل گرم ہے، ستار اور ہارمونیم کے لوازم کے ساتھ گانا، امردوں کا بلکہ نامحرموں کا سناجارہاہے نذر نقود کا مجمع ہے، عرس کی تاریخیں آگئی ہیں، قبروں پر چادریں چڑھ رہی ہیں، منتیں مانی اور مرادیں مانگی جارہی ہیں، مٹھائیوں کے دونے اور حلوے، توشے کے خوان پیش ہو رہے ہیں، نذرونیاز، چڑھاوے کے نام سے روپیہ پیسہ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، گفتگو میں سارے منہیات شرعی کا ارتکاب بے تکلف ہو رہا ہے، نہ غیبت سے بچنے کی فکر، نہ دلآزاری سے محتاط رہنے کا اہتمام تو غرض یہ کہ سائل کے پیش نظر عموماً اس طرح کے منظر ہوتے ہیں اور پھر شبہات وسوالات پیش کئے جاتے ہیں، نفس تصوف وسلوک

بیعت سے متعلق! ——— گویا چوراہے کے اشتہاری دوا فروش یا محلے کے اناڑی "نیم حکیم خطرۂ جان" پر قیاس حکیم اجمل خاں اور حکیم محمود خاں دہلوی کے مطب کا کیا جا رہا ہے! ——— جو چیزیں سلوک و طریقت سے الگ ہی نہیں بلکہ ان کی عین ضد ہوں انھیں دیکھ کر نفس طریق کی طرف سے مشکوک یا بدگمان ہو جاتا، یہ تو سائل کا ظلم خود اپنی بصیرت پر ہوا۔[1]

سوال میں ذکر اتباع رسول کا کیا گیا ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے، کہ سوال کے پیش منظر میں اتباع صرف افعال خارجی اور اعمال ظاہری کا رہا، حالانکہ پیکر خاک کے اندر ایک نور پاک بھی جلوہ گر تھا، اور اس نور کی تجلی پیہم، ہر لحظہ اور ہر گھڑی ہوتی رہتی تھی تمام صحابہؓ ہر حیثیت سے مساوی نہ تھے، اپنا اپنا ظرف تھا، خالدؓ جانباز میدان جہاد

---

[1] آپ بیتی کا بھی ایک ٹکڑا اسی سلسلہ میں سنتے چلیے، ۱۹۲۶ء کا ذکر ہے، لکھنؤ (مضافات امین آباد) میں ایک اچھے نامور مسلمان ڈاکٹر صاحب تھے، جنھیں مذہبی بحث مباحثوں کے سننے میں خاص لطف آیا کرتا تھا، ایک روز جو میں حاضر ہوا تو ایک اجنبی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، ڈاکٹر صاحب مجھے دیکھ کر کھل گئے، اور بولے آپ خوب موقع سے آگئے، ذرا ان صاحب سے بحث کیجیے، یہ تصوف کے شدید منکر ہیں، وہ صاحب بھی جیسے مناظرہ کے لئے تلے بیٹھے تھے، فوراً میری طرف متوجہ ہو گئے، میں نے عرض کیا، گفتگو سے قبل موضوع کا صاف ہو جانا ضروری ہے، غرض یہ ہے کہ گفتگو کس تصوف پر ہوگی، آیا بدعتی شاہ، نقلی شاہ، قبر و شاد کے ہو حق پر یا اس طریق پر جو حضرت جیلانیؒ اور شیخ سہروردیؒ وغیرہ اکابر فن کی کتابوں میں مدون ملتا ہے، اگر پہلے پر ہے تو میں پہلے ہی سے اپنی ہار مانے لیتا ہوں، باقی اگر فتوح الغیب یا عوارف یا کتاب اللمع یا قشیریہ پر آپ کو کچھ فرمانا ہے تو بسم اللہ میں سنوں گا، کہ ان کے کون کون سے مقامات آپ کو کتاب اللہ یا سنت رسول کے مخالف نظر آتے ہیں" بس اتنے پر وہ صاحب تو کچھ کھو سے گئے، اور ڈاکٹر صاحب اپنا دل پسند تماشا دیکھنے سے محروم رہ گئے۔

کے یکہ تازہ ہوئے، ابوہریرہؓ روایات حدیث کی اشاعت میں لگے رہے، ابن عباسؓ کی قسمت میں ترجمان القرآن بننے کی سعادت آئی، ابن عمرؓ نے ترویج سنت کی خوش نصیبی پائی، ابوبکر صدیقؓ نے زمام خلافت کو سنبھالا، غرض ہر ایک کا مذاق طبیعت جداگانہ تھا، اور استعداد و صلاحیت الگ الگ۔ اکثریت کی توجہ قدرۃً امور خارجی پر زیادہ رہی، رسولؐ نے نماز میں ہاتھ سینہ پر باندھے یا ناف پر؟ آمین سورۂ فاتحہ کے ختم پر آواز سے کہی یا آہستہ؟ اس قسم کے مسائل کا مطالعہ بڑی تفصیل و وسعت سے ہوتا رہا، لیکن ایک دوسری جماعت کی نظر قال سے زیادہ حال پر، ظاہر سے زیادہ باطن پر رہی، انھوں نے محض غزوۂ بدر اور فتح مکہ کا جاہ و جلال ہی نہیں دیکھا، بلکہ غار حرا کی خلوت آرائیوں کا بھی مزہ چکھا، انھوں نے محض حرض المومنین علی القتال ہی کا پیام نہیں سنا، بلکہ سبحان الذی اسری بعبدہٖ کی حقیقت کو بھی پہچانا، ان کی نگاہیں یہیں تک محدود نہیں رہیں کہ نماز میں رکعتیں کتنی اور کس قاعدہ سے پڑھی گئیں بلکہ یہاں تک بھی پہونچیں کہ نماز کس ذوق شوق سے پڑھی گئی، خضوع و خشوع کی کیا کیفیتیں طاری رہیں، اور زبان کے ساتھ دل کن کن منزلوں سے گذرتا رہا۔ اس نعمت کے حصہ دار کم و بیش تو سب ہی صحابی تھے، لیکن جو خصوصیت کے ساتھ اس دولت سے مالامال رہے، اور آج بھی ہر شجرۂ طریقت کے سر سلسلہ ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ و حضرت علیؓ مرتضےٰ، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت سلمانؓ وغیرہم بلکہ بعض قدیم کتب سلسلہ میں تو صراحت کے ساتھ نام حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے بھی درج ملتے ہیں۔

شریعت اور طریقت کے درمیان رشتہ تضاد و نسبت تنافی جو ہمارے دلوں میں خدا معلوم کب سے اور کہاں سے جاگزیں ہو گئی ہے، یہ تو تمامتر ہماری ہی پیدا کی ہوئی ہے ورنہ اکابر طریقت تو اس سے صاف لفظوں میں تبری کرتے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ شریعت کے نقطۂ کمال ہی کا نام طریقت ہے، اتباع رسولؐ جبتک ظاہر و خارج، اعضاء و

جوارح تک محدود ہے، اس کا نام شریعت ہے، اور جب قلب و باطن بھی اسی نورانیت سے منور ہو گیا، تو یہی طریقت ہے۔ ایک شخص نے نماز ظاہری ضابطوں اور قاعدوں کے مطابق پڑھ لی تو اس کی نماز شریعت کی نظر میں ہو گئی۔ فقیہ اسے کافی سمجھے گا لیکن اہل طریق اس پر مطمئن نہ ہوں گے، ان کا اس پر اصرار ہو گا، کہ جس طرح چہرہ خانۂ کعبہ کی طرف رہا، قلب رب کعبہ کی جانب متوجہ رہے اور جس طرح جسم و لباس ظاہری نجاستوں سے پاک رہا، دل و دماغ بھی اندرونی تاریکیوں، آلائشوں، پراگندہ خیالیوں سے پاک صاف رہے، —— یہ شریعت کی مخالفت ہوئی یا عین منشائے شریعت کی تکمیل؟

اکبر الہ آبادی جس پایہ کے شاعر ہوئے ہیں، اسی درجہ کے حکیم و عارف بھی تھے، ایک طویل نظم انھیں مقامات شریعت و منازل طریقت کی شرح و توضیح میں کہی ہے دو چار شعر ملاحظہ ہوں،

شریعت در محفل مصطفےٰ! طریقت عروج دلِ مصطفےٰ!
عبادت سے عزت شریعت میں ہو محبت کی لذت طریقت میں ہے،
شریعت میں ہے صورت فتح بدر طریقت میں ہے معنیٔ شق صدر
نبوت کے اندر رہی ہیں دونوں رنگ عبث ہے یہ ملا و صوفی کی جنگ

انھیں کی ایک دوسری نظم کے دو شعر ؎

ملا پکارتے ہیں منطق کی جنگ اچھی صوفی کا ہے ترانہ حق کی ترنگ اچھی
ملا یہ کہہ رہے ہیں قرآن ہی سے پڑھئے صوفی یہ کہہ رہے ہیں معنی سمجھ کے پڑھئے

اور ایک اور مصرعہ

شریعت ہے تم کو طریقت ہے تم میں

آخر یہ ارشاد بھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ایک باخبر سائل کے

جواب میں ہے کہ

قال ما الاحسان قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک، (بخاری کتاب الایمان)	احسان اس کا نام ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کی جائے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے نہیں دیکھ سکتا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے،

پوری حدیث ذرا طویل ہے، اس میں ایمان کی تشریح بعض عقائد سے کی گئی ہے، اور اسلام کی توضیح بعض اعمال سے، اس کے بعد تیسری توضیح احسان کی ہے، گویا عقیدہ و عمل دونوں کے بعد ایک تیسری منزل ان سے بلند تر احسان کی آتی ہے، جس کا تعلق صرف جاننے اور ماننے اور کرنے اور برتنے سے نہیں بلکہ مشاہدہ و رویت سے بھی ہے، اور یہی منزل سلوک و طریقت کی ہے، مشہور عارف و فاضل شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اہل تصوف کے بجائے "اہل احسان" ہی کی اصطلاح آیۂ قرآنی والذین اتبعوھم باحسان سے اخذ کرکے اختیار کی ہے اور بعض اہل علم نے اہل صدق اور صدیقین کی اصطلاحوں کو چلانا چاہا ہے لیکن خیر، یہ ساری بحثیں لفظ و اصطلاح کی ہیں، اصل سوال صرف یہ ہے کہ ایمان کے اجزاء اور اسلام کے ارکان تو کتابوں سے بیشک دریافت ہو جاتے ہیں، لیکن ہر عمل کے پیچھے جو روح عمل کارفرما ہوتی ہے، وہ محض ان کتابی واسطوں، اور نوشتوں سے پوری طرح حاصل کرلی جائے؟ قلب کو مرتبۂ احسان تک پہنچانا، باطن کا تزکیہ، نفس کا جلا، اخلاق کی پاکیزگی، عادت و خصلت میں ایثار، یہ سب بغیر ایک زندہ معلم کی وساطت کے عموماً و عادۃً کیونکر ممکن ہے؟ جو قانون اور ضابطے کتابوں میں درج کرنے والے تھے، وہ بیشک بڑی تحقیق اور پوری

تفصیل کے ساتھ حدیث و آثار و فقہ کی کتابوں میں مدون ہوتے رہے، لیکن جو چیزیں ایک قلب سے براہ راست دوسرے قلب میں منتقل ہونے کی ہیں، ان کے لئے کاغذ کے طومار اور روشنائی کے ڈھیر کس حد تک کافی ہو سکتے ہیں؟ ہر عمل ظاہر ہے کہ اپنی ایک صورت بھی رکھتا ہے، اور ایک روح بھی، فقہ کا تعلق صورت عمل سے ہے، اور سلوک و طریقت کا روح عمل سے۔

پھر یہ بھی خوب لحاظ رہے، کہ جسے شیخ یا مرشد کہا جاتا ہے، وہ کوئی خود رائے اور خود رو ہستی نہیں ہوتی، قرآن مجید کی محفوظیت کے قائل ہم آپ، اس کی سند متصل ہی کی بنا پر تو ہیں اور بخاریؒ کی بھی کوئی روایت، اسی لئے تو حدیث رسول تسلیم کی جاتی ہے، کہ وہ معتبر سند مسلسل کے ساتھ چلی آتی ہے، بس کچھ اسی طرح، گو یقیناً اسناد قرآن تو کجا، اسناد حدیث سے بھی کہیں ہلکے پیمانہ پر، پیر و مرشد کا قلب، بھی واسطہ در واسطہ، سلسلہ بہ سلسلہ، مرشد کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک سے ملا ہوتا ہے، اس کا رابطہ روحانی بھی ایسی کچھ ہی زنجیر کی کڑیوں کی طرح سرچشمۂ تقدیس و روحانیت سے جڑا ہوتا ہے؟ ایک گروہ بخاریؒ، مسلمؒ و ابوحنیفہؒ و شافعیؒ کی قیادت میں اگر اخبار رسولؐ آثار رسولؐ کو اپنے ضخیم دفتروں میں مدون کرتا رہا، تو دوسری طرف کچھ لوگ حسن بصریؒ اور ابو طالب مکیؒ کی امامت میں اسرار رسولؐ اور انوار رسولؐ سے اپنے قلب و سینہ کو گلزار کرتے رہے، اِدھر رسولؐ کا قال ایک سفینہ سے دوسرے سفینہ میں نقل ہوتا رہا، اُدھر رسولؐ کا حال ایک سینہ سے دوسرے سینہ کو طور سینا بناتا رہا۔

دونوں شعبوں کی جامعیت، اور کاملیت قرون اولیٰ میں بھی ہر خوش نصیب کے حصہ میں یکساں نہیں آئی تھی پھر آج اس کے نمونے کثرت سے کیوں نظر آنے لگے تاہم کوئی زمانہ ایسی ہستیوں سے بالکل خالی بھی نہیں رہتا، حکیم الامت مولانا

اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کو دیکھنے والی آنکھیں تو ابھی ہزارہا کی تعداد میں موجود ہیں، کاملین کسی فن کے کسی زمانہ میں بھی کثرت سے نہیں ہوتے، پھر جو فن سب فنوں سے لطیف تر و شریف تر ہو، اس کے ماہرین و کاملین ظاہر ہے کہ انگلیوں ہی پر شمار کرنے کے قابل ہوں گے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے، کہ یہاں بحث کثرت و قلت سے نہیں، نفس وجود سے ہے۔

سوال کیا گیا ہے، کہ کوئی مسلمان اگر اپنی فطری صلاحیت سے اپنے اخلاق کی اصلاح کر لینا چاہے، تو کیا ایسا ممکن نہیں، ممکن بے شک ہے، لازمی اور ناگزیر تو صرف تصدیق نبوت ہے، ایک نبی تو بے شک ایسا ہوتا ہے کہ اس پر ایمان لائے بغیر محض اپنی طبیعت یا خالص عقل و استدلال کی مدد سے کسی انسان کا صالح و مقرب بن جانا ممکن نہیں، باقی اس کے سوا کسی بڑے سے بڑے صالح یا مصلح یا نائب نبی کا اتباع بلکہ تصدیق بھی ناگزیر ہرگز نہیں، یہ مرتبہ تو صرف نبی کے لئے مخصوص ہے لیکن دوسری طرف، عام فطرت بشری ہے ایسی کہ بغیر کسی صالح و مصلح شخصیت کی رہنمائی و توسط کے تزکیہ اخلاق کا کافی حد تک ہو جانا، عموماً اور عادۃً آسان نہیں، کمتر ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو محض اپنی عقل سلیم اور کتابوں کی مدد سے صالحیت کے مرتبہ پر پہونچ جائیں، ورنہ اکثر و بیشتر تو ضرورت ایک رہنما، استاد، معلم یا ہادی کی رہتی ہی ہے، بلکہ بعض طبیعتیں تو ایسی ہوتی ہیں، جن میں انقیاد و اطاعت کا مادہ خلقۃً کم ہوتا ہے، اور تنقید و نکتہ چینی کا زیادہ، ایسوں کے لئے تو کسی شیخ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینا بجائے مفید کے مضر ہی پڑے گا، شیخ بھی بہرحال بشر ہی ہوتا ہے، ایسے اشخاص کی نظر اس کی بشری کمزوریوں ہی پر زیادہ پڑے گی، اور اس سے بجائے نفع کے الٹے نقصان ہی کا اندیشہ ہے، غرض کسی شیخ کے اختیار کرنے پر یہ جو زور دیا گیا ہے، اس کی حیثیت کلیہ کی نہیں، لیکن اکثریہ کی ہے،

لیکن اس تجربی اور علمی شہادت سے قطع نظر جس اقتدا اور رسول و اتباع رسول پر حدیث کیا معنی نصِ قرآنی تک ناطق ہے، اُس حکم اقتداء و اتباع کو صرف احکام ظاہر تک محدود رکھنے کی آخر کیا دلیل ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ حکم اطاعت رسول جہاں کہیں بھی وارد ہوا ہے، مطلق وغیر مُعیّن صورت میں آیا ہے، ظاہر و باطن کی اس میں کوئی تخصیص نہیں، دونوں کے مجموعہ پر شامل ہے، نماز کے اوقات، رکعات کی تعداد، رکوع و سجود کی ہیئت، قرأت و قیام و تشہد کی نوعیت ہی نہیں، بلکہ نماز کے اندر خضوع و خشوع، حضورِ رب، میں ذوق و شوق وغیرہ بھی تو اس اسوۂ حسنہ ہی کے حکم میں داخل ہیں، گو ظاہر ہے کہ ان لطائف و دقائق کا ادراک بھی چونکہ جلی نہیں، اس لئے ان کا تحقق بھی نسبۃً خفی ہی ہوگا۔ تو غرض یہ کہ اس پیروی باطن رسول کی کیا صورت بجز اُس شخصیت کی پیروی کے ہے، جسے رسول سے سلسلہ بہ سلسلہ یہ نعمت مل چکی ہو، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اصل مقصد بھی تو کلام مجید میں تلاوت آیات الٰہی کے بعد ایک نہیں دو بتائے گئے ہیں،

رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ	ایک تزکیۂ نفس و تقوائے قلوب
وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ	دوسرے تعلیم و تشریح کتاب و حکمت

کتاب و حکمت کی تعلیم و تشریح کا سامان تو الحمد للہ محدثین و فقہاء کی تربتوں کو ٹھنڈا رکھے، ان کی جانفشانیوں سے ہو گیا، لیکن حکم تزکیۂ نفوس کی تعمیل کی عملی صورت آخر کیا ہو؟ یا خدانخواستہ کچھ یہ صورت ہے کہ امت نے اس حکم کو قابل تعمیل ہی نہ سمجھا؟ نہیں اور سو بار نہیں، "مرشد کی تلاش" یعنی ایک زندہ و مکمل نائب رسول سے تعلق اتباع، اس سوال کا جواب ہے، مرشد کے لفظ سے ذہن ہرگز چادر اور گاگر، مزار اور صندل، ستار اور طنبورہ کی طرف منتقل نہ ہو، مراد اس سے صرف ایک زندہ روحانیت ہے،

یہ مرشد صحیح معنے میں مقلد محض ہوتا ہے، استاد ازل کے سبق کو دہرا دینے والا، آئینہ کے عقب میں طوطی ـــــ ایجاد و اختراع ہرگز اس کا منصب نہیں۔ لیکن اجتہاد جزوی اور استنباط کا دروازہ تو مقلدوں کے ماہرین فقہ اور غیر مقلدوں کے ماہرین حدیث دونوں کے لئے کھلا ہوا ہو پھر اس رحمت عالم کا دروازہ غریب صوفی ہی کے حق میں کیوں بند رہے؟ وہ اپنے تجربات و مشاہدات کی طرف سے آنکھیں بند نہ رکھے گا، جس طرح اہل ظاہر اپنے حواس و عقل کو معطل نہیں کر دیتے، وہ نور نبوت ہی کی روشنی میں تدبیریں اور معالجے وقت اور ماحول کی مناسبت سے مرض کی نوعیت اور مریض کے مزاج کے مطابق نکالتا اور بتاتا رہے گا، یہ اس کی خود رائی نہ ہوگی، عین اجرائے حکم دین ہوگا، یہ بدعت کی نہیں اتباع سنت ہی کی صورت ہوگی، البتہ اس کے لئے بھی حدود و قیود ضرور ہیں، جس طرح کہ اہل ظاہر کے لئے احکام کے اجتہاد و استنباط کے لئے قاعدے ہیں، پابندیاں ہیں، یہ نہیں کہ اندھا دھند وہ جس چیز کا چاہے، حکم دیدے، جس عمل کو چاہے ممنوع ٹھہرا دے۔

مصیبت یہ ہے کہ دلیل کے مقدمات میں مثالیں، بہروپیوں کی، اناڑیوں کی پیش نظر رہتی ہیں، اور نتائج نکالتے وقت سرے سے اصلیت و واقعیت ہی سے انکار کر دیا جاتا ہے، یہ کہاں کا انصاف اور تقاضائے دیانت ہے، کہ اگر آپ کئی بار پیتل پر سونے کا دھوکا کھا چکے ہیں، تو آپ سونے کے وجود ہی سے منکر ہو جائیں، اگر چوراہے کے اشتہاری دوا فروش آپ کو ٹھگ چکے ہیں، تو آپ اطباء حاذقین کے بھی دشمن ہو جائیں، یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ "بیعت کا مقصد اگر دعوت الی الحق ہے تو مشائخ کی جماعت اس فرض کو کہاں تک ادا کر رہی ہے" سوال معقول ہے، لیکن تلاش ہمیں کیوں ختم کر دی جاتی ہے، علماء ظاہر کا بڑا گروہ آج کب فریضہ امر بالمعروف ادا کر رہا ہے، امرائے امت کہاں تک اسلام کے بتائے ہوئے ملکی

چل رہے ہیں، تاجروں کو کتنا خیال دیانت واکل حلال کا باقی رہ گیا ہے، وقس علیٰ ہذا ظاہر ہے کہ امت کا کوئی سا طبقہ بھی آج اگر اپنے فرائض پر چشان کی طرح قائم ہوتا، تو امت کو یہ دن دیکھنا ہی کیوں نصیب ہوتا، اچھے برے، نیک و بد، کھرے کھوٹے، امت کے ہر طبقہ کے اندر ہیں، بدوں کی اکثریت سے گھبرا کر نیکوں کی اقلیت کے وجود سے انکار کر بیٹھنا نہ قرین عقل ہے، نہ تقاضائے شریعت،

نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند

تصوف، وسلوک کے نام کو بدنام کرنے والوں کے ہجوم عام میں اُسے نیک نام رکھنے والے کچھ حقیقی صوفی تو ہمیشہ کی طرح آج بھی موجود ہیں،

شاہ ولی اللہ دہلویؒ جو اپنے زمانے میں اس فن کے امام ہوئے ہیں، اپنے رسالہ القول الجمیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ بیعت سنت رسول ہے، اور بیعت کا اطلاق صرف بیعت خلافت تک محدود نہیں بلکہ عہد نبوت میں بیعت کی مختلف صورتیں تھیں، مثلاً بیعت خلافت، بیعت جہاد، بیعت توبہ وغیرہ ــــ صوفیہ کی مروجہ بیعت، بیعت تقویٰ میں داخل ہے، خلفائے راشدین کے زمانہ میں اس بیعت کی علیحدہ ضرورت نہ تھی، اس لئے کہ ان سے جو بیعت خلافت ہوتی تھی اس میں یہ بیعت بھی داخل و شامل ہوتی تھی، اس کے بعد ایک عرصہ تک، یہ بیعت، بیعت خلافت کے ساتھ التباس و اشتباہ کے اندیشہ سے ملتوی وموقوف رہی، اور وہ صوفیہ اس بیعت کا قائم مقام خرقہ کو سمجھتا رہا، پھر جب ملوک وسلاطین کا دور دورہ پوری طرح ہوگیا، اور خلافت رسول کی بیعت بند سی ہوگئی، تو صوفیہ کرام نے بیعت تقویٰ کی سنت مردہ کو پھر سے زندہ کیا، ــــــ آگے چل کر جہاں بیعت لینے والے مرشد کے اوصاف وخصائص شمار کرتے ہیں، وہاں ایک خصوصیت یہ بھی بیان کرتے ہیں۔

والشرط الخامس ان یکون تصحب المشائخ وتادب بھم دھراً طویلاً واخذ منھم النور الباطن والسکینۃ وھذا الان سنۃ اللہ جرت بان الرجل لایفلح الا اذاری المفلحین کما ان الرجل لایتعلم الا بصحبۃ العلماء وعلی ھذا القیاس غیر ذالک من الصناعات

پانچویں شرط یہ ہے کہ اس کو مشائخ کی صحبت رہی ہو اور اس نے ان سے ایک عرصہ دراز تک ادب اور قاعدے سیکھے ہوں اور ان سے باطن کا نور اور اطمینان حاصل کیا ہو، اور یہ شرط اس لئے ہے کہ عادت اللہ یوں ہی جاری ہے کہ کسی کو مراد اس وقت تک نہیں ملتی جب تک وہ مراد پانے والوں سے نہ مل سکا ہو، اسی طرح جس طرح علم بغیر صحبت علماء کے حاصل نہیں ہوتا، نیز دوسرے ہنر بغیر استاد کے۔

مقالہ یوں ہی بہت طویل ہو گیا ورنہ موقعہ تھا کہ محقق دہلوی کے قول کی تصویب و تائید میں خود قرآن مجید سے استناد کیا جاتا، اور آداب مرشد پر مکالمۂ حضرت موسیٰ و خضرؑ سے کچھ روشنی حاصل کی جاتی، نیز خلیفۃ اللہ کے آگے از راہ کبر و انانیت سر نہ جھکانے کی وعید پر قصۂ آدم و ابلیس سے کچھ لطائف و اشارات درج کئے جاتے،

رہے اذکار و اشغال اصطلاحی اور رسوم صوفیہ مثلاً خرقہ پوشی، سو اول تو ان کا کوئی لازمی تعلق مقصود بیعت اور تلاش مرشد سے ہے نہیں، اور پھر ان میں سے اکثر چیزوں کی اصل، کسی نہ کسی حد تک سنت و آثار میں بھی مل جاتی ہے، جیسا کہ شیخ قشاشیؒ کے پر معلومات رسالہ السمط المجید (مطبوعہ دائرۃ المعارف

حیدر آباد دکن) سے ظاہر ہو گا، اور ہمارے زمانہ کے شیخ اعظم، حکیم الامت تھانویؒ نے تو یہاں تک صاف کر دیا ہے، کہ خود رسم بیعت یعنی (مرشد کا ہاتھ پکڑنا) ایک بالکل ثانوی حیثیت بلکہ اس سے بھی کم تر درجہ کی چیز ہے، راہ سلوک میں جو کچھ اہمیت ہے، وہ مرید کی طرف سے صرف اس کے اخلاص ارادت اور عزم اتباع شیخ کی ہے،

ایک ضمنی سوال یہ تھا کہ حدیث نبوی من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ الجاھلیۃ سے کیا مراد ہے؟ سو اس کے جواب میں عرض ہے، کہ اس کا تعلق اطاعت امیر و خلیفہ سے ہے، صوفیہ کی مصطلح بیعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں، امام مسلم اسے اپنی صحیح میں کتاب الامارۃ میں لائے ہیں، اور مشکوٰۃ میں کتاب الامارۃ ہی میں نقل ہوئی ہے، پوری حدیث کے الفاظ یہ ہیں،

عن عبد اللہ بن عمر قال سمعت رسول اللہ صلعم یقول من خلع یدا من طاعۃ لقی اللہ یوم القیامۃ لا حجۃ لہ ومن مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ الجاھلیۃ،	عبد اللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو کوئی اطاعت (امیر) ترک کر دے گا، وہ اللہ کا سامنا قیامت میں یوں کرے گا کہ کوئی عذر اس کے پاس نہ ہو گا، اور جو اس حالت میں مر جائے گا کہ اس کی گردن میں طوق بیعت نہ ہوا، تو وہ گویا جاہلیت کی موت مرا،

اس سے ملتی ہوئی اور بھی متعدد حدیثیں صحیحین میں کتاب الامارۃ اور کتاب الاحکام کے ماتحت وارد ہوئی ہیں، ان سب کا مقصد اطاعت امیر اور لزوم جماعت کی

تاکید ہے، چنانچہ خود مسلم ہی کی ایک دوسری حدیث کے الفاظ ہیں،

من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات مات میتة الجاھلیة	جو شخص اطاعت (امیر) سے نکل گیا اور جس نے جماعت (امت اسلامیہ) کو ترک کر دیا، اور مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا،

باقی جہاں بدقسمتی سے اسلامی حکومت ہی سرے سے نہ ہو، اور کوئی خلیفہ یا امیر یا امام مسلمین موجود ہی نہ ہو، وہاں بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے، کہ امت نصب امیر کی کوشش میں برابر لگی رہے، اور اس درمیان میں اس کے قریبی مرتبوں کی تلاش جاری رہے،

عوام کے ذہن میں مرشد کی تعظیم و احترام کا جو مبالغہ آمیز اور شرک سے ڈانڈے ملا دینے والا تخیل قائم ہو گیا ہے، اُس میں اعتدال پیدا کرنا اور اس کی اصلاح ہی ضروری ہے، شیخ اول تو درجۂ کامل کے ہیں ہی کمیاب ــــ اور پھر بالفرض وہ کامل سے کامل ہوں، جب بھی بہرحال معصوم تو نہیں ہو سکتے، مرتبہ عصمت و معصومیت صرف انبیائے کرامؑ کے لئے مخصوص ہے، شیخ غلطیاں بھی کرے گا اور اجتہادی غلطیاں تو ممکن ہے کہ کثرت سے کر جائے، دائرۂ طریقت و شریعت کے اندر بھی وہ ہر خطا و لغزش سے محفوظ نہیں، اور اُن کے باہر دنیا کے عام مسائل میں تو اس کی رائے وہی درجہ رکھتی ہے جو دوسرے انسانوں کی لغزشوں بلکہ معصیتوں کا صدور بھی اس سے ناممکن نہیں، بہرحال وہ ایک بشر ہی ہے، غیر معصوم۔ البتہ اس کے فضائل و کمالات کا پلہ نسبتہً بہت بھاری ہوگا۔ گناہوں کا صدور اُس سے کمتر ہی ہوگا، کبائر اصرار و تواتر کے ساتھ، اُس سے صادر نہ ہوں گے، اور بحیثیت مجموعی اُس کی بصیرت دینی اور روحانی معاملات

میں تقرب الی اللہ کے وسائل و مسائل میں بہت صاف ہو گی۔

خلاصہ چند لفظوں میں یوں سمجھئے کہ

(۱) حقیقی نائبان رسول اور مصلحین کے زندہ نمونے ہر دور میں موجود رہتے ہیں، اجزائے دین میں عملی رسوخ عام سنت الٰہی کے مطابق انھیں کی صحبت و معیت سے پیدا ہوتا ہے،

(۲) اپنے امکان بھر کوشش و تلاش کر کے اپنے کو اُن تک پہنچانا اور ان سے عملی تعلیم حاصل کرنا چاہیئے۔

(۳) تاہم یہ کوئی درجہ فرض یا واجب کی چیز نہیں، اگر کسی کی رسائی ایسے مصلح تک نہ ہو سکے یا اس پر اپنی طبیعت نہ جمے تو وہ معذور ہے،

(۴) احکام دین درجہ ضروری میں اُسے جس طرح بھی پہونچ جائیں، بس نجات و مغفرت کے لئے انھی پر عمل کافی ہے،

(۵) مرشد کا وجود ایک نعمت ہے، البتہ اسے وہ درجہ اہمیت بھی حاصل نہیں جو اہل غلو نے اسے دے رکھا ہے[1]

---

[1] اکبر الہ آبادی کا ایک شعر جو محض دل لگی کا نہیں ؎

تجربہ خود ہی بتا دیتا ہے مرشد اکبر ۔۔۔ سچ کہا آپ نے پیری ہی مریدی کیسی